

سلسلہ منشورات دینیات فیکلٹی ۲

# چار علمی مقالات

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

صدر شعبہ سنی دینیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

۶۱۹۶۶

# پیش لفظ

حادثاً و مصلیاً

یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے چار مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلے دو مقالے علی الترتیب قرآن مجید کے دو لفظ ”الصائبون“ اور ”الامیون“ کی تحقیق پر مشتمل ہیں۔ تیسرا مقالہ آٹھویں صدی ہجری کے اندسی شعرا کے ایک اہم تذکرے سے متعلق ہے۔ جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا، یہ تذکرہ صرف مخطوطہ کی شکل میں محفوظ تھا، لیکن ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر احسان عباس صاحب نے اس کو اڈٹ کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ دارالثقافتہ بیروت کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ لیکن انھوں نے جن تین نسخوں پر اپنے اڈیشن کی بنیاد رکھی ہے ہمارا مخطوطہ ان میں شامل نہیں ہے۔ اب رہا چوتھا اور اس مجموعہ کا آخری مقالہ ”مالک بن نویرہ کا واقعہ اور حضرت خالد بن الولید“ تو یہ عمدہ تصدیقی کے ایک نہایت اہم تاریخی واقعہ کی اصل حقیقت کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات جن مجلات میں شائع ہوئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) الصائبون :- ماہی فکر و نظر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ جولائی ۱۹۶۳ء

(۲) الامیون :- ایضاً اکتوبر ۱۹۶۳ء

(۳) آٹھویں صدی ہجری کے اندسی شعرا کا ایک تذکرہ :- ارمنان علمی بخدمت پرہ فیسرت محمد شفیع مرحوم

منجانب مجلس ارمنان علمی لاہور ۱۹۵۵ء

(۴) مالک بن نویرہ کا واقعہ :- ماہنامہ برہان دہلی۔ جولائی ۱۹۵۶ء  
سعید احمد اکبر آبادی  
یکم ستمبر ۱۹۵۶ء



## فہرست مضامین

صفحات

مضمون

نمبر شمار

۱

۱ ( پیش لفظ

۱

۲ ( الصابون

۴۱

۳ ( الامیون

۴ ( آٹھویں صدی ہجری کے اندلسی شعرا کا ایک تذکرہ

۵ ( مالک بن نویرہ کا واقعہ اور حضرت خالد بن ولید



## الصّابون

قرآن مجید میں جو چند مقامات مشکل سمجھے گئے ہیں ان میں وہ آیت بھی شامل ہے جس میں صابون کا ذکر اہل کتاب اور مومنین کے ساتھ کیا گیا اور ان سب کو ایک ہی حکم کے ماتحت رکھا گیا ہے:

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے یہودی مذہب	”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصْرِيَّ
اختیار کیا اور نصاریٰ اور صابیین (بہر حال) جو	وَالصَّابِئِينَ مِنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک	وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
عمل کرے گا تو اس کے رب کے پاس اس کا اجر	وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“
اور ان لوگوں کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔	(البقرة آیت ۶۲)

یعنی اسی مضمون کی ایک دوسری آیت نمبر ۶۹ سورہ المائدہ کی ہے جس کے الفاظ بھی یہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ”وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کے بعد ”فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ“ کے الفاظ نہیں ہیں اور ”وَلَا خَوْفٌ“ کے بجائے ”فَلَا خَوْفٌ“ ہے۔

اشکال کی اصل بنیاد:

اشکال کی اصل بنیاد دو چیزیں ہیں۔ ایک آیت کا نفس مطلب دوسری یہ کہ صابون سے کون سا طبقہ مراد ہے؟ جہاں تک نفس مطلب کا تعلق ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ آیت میں پہلے چار طبقات مومن، یہودی، نصرانی اور صابی کا ذکر علی الترتیب ”إِنَّ“ کے اسم کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور پھر یہ طور خبریہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان چاروں طبقات کے لوگوں

میں سے جو شخص بھی اللہ اور یوم آخر پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح کرے گا اس کے لیے اللہ کے پاس اس کا اجر ہوگا۔ اس کے لیے کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوگا۔  
اب سوال دوپیدا ہوتے ہیں :

(۱) جب "ان الذین آمنوا" سے خود یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں تو پھر خبر کے مرتبہ میں ان کو بھی "من آمن باللہ" (جو بھی ایمان لے آئے گا) میں شامل کرنے کا کیا مقصد ہے؟

(۲) اس آیت میں مدارِ نجات صرف دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک ایمان اور دوسرے عمل صالح اور ایمان میں صرف ایمان باللہ اور بالیوم الآخر کا ذکر ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ ایک یہودی یا عیسائی یا صابی اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے (اور اسی مذہب کے ساتھ نسبت سے پکارے جانے کے باوجود) اگر اللہ اور یوم آخر پر ایمان لے آتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے تو آخرت میں اس کی نجات ہو جائے گی۔

اس اشکال کے نمبر ایک کا جواب یہ ہے کہ "الذین آمنوا" سے وہ لوگ مراد ہیں جو رسمی طور پر مسلمانوں کے زمرہ میں داخل ہیں یعنی کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے اور مسلمان نام کی وجہ سے یا زبان سے کلمہ شہد پڑھنے اور اپنے متعلق مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باعث مومن سمجھے جاتے ہیں۔ رہا "من آمن" تو یہاں ایمان سے مراد سچ مچ مومن ہونا اور دل سے تصدیق کرنا ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ رسمی طور پر مومن ہیں یا جو اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے جو لوگ واقعی اور حقیقی مومن ہوں گے تو قرآن میں اسی مضمون کو اور متعدد مواقع پر بھی بیان کیا گیا ہے: ایک جگہ فرمایا گیا "یا ایہا الذین آمنوا آمنوا" اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو سچ مچ ایمان لاؤ۔ سورہ الحدید میں ہے "یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ و آمنوا برسولہ" اے ایمان لانے والو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر سچ مچ ایمان لاؤ۔ علاوہ بریں

لے "من آمن" کے بعد "منہم" مقدر ہے تب ہی اس جملہ کا تعلق ماقبل کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔ تفسیر ابن جریر

طبری مطبوعہ دار المعارف مصر ج ۳ ص ۱۴۸

اعراب جو اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ان کی نسبت فرمایا گیا "وقالت الاعراب آمننا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا و لما يدخل الايمان في قلوبكم"۔ اعراب کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں" (مگر) آپ کہہ دیجیے "تم ایمان نہیں لائے" مگر ہاں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے اور ایمان اب تک تمہارے قلوب میں داخل نہیں ہوا ہے۔ ان سب آیات کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت مدارِ نجات وہ ایمان ہے جس میں تصدیقِ قلب پائی جائے۔ جب دل سے کسی چیز کی تصدیق ہوتی ہے تو زبان سے بھی وہی نکلتی اور عمل بھی اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہمارے مشکلمین نے ایمان کی تعریف اور عمل کے ساتھ اس کے تعلق پر جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں وہ کوہِ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ وسیع نہیں قرآن نے "ولما يدخل الايمان في قلوبكم" کہہ کر ایمان کی اصل حقیقت کو نہایت صاف اور واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایمان کی قسمیں دو ہیں ایک حقیقی ایمان جس میں دل سے تصدیق پائی جائے اور دوسرا وہ ایمان جو محض رسمی اور ظاہری ہو۔ چونکہ ایمان حقیقی ہے یا نہیں؟ اس کا پتہ سوائے باری تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا اس بنا پر آخرت میں نجات کا دار و مدار بھی ایمان ہے۔ مگر دنیوی معاملات میں وہ شخص بھی مومن سمجھا جائے گا جو محض رسمی ایمان رکھتا ہے، تا وقتیکہ اس کی زبان یا اس کے عمل سے کسی ایسی چیز کا صدور ہو جو صریحاً کفر اور ایمان کی نقیض ہے۔ بعض مفسر ایسے مواقع پر لکھتے ہیں کہ آیت میں دوسرے آمنوا کے معنی "ابنتوا" ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! ایمان پر ثابت قدم رہو۔ لیکن ہماری رائے میں اگر ایمان حقیقی ہے اور تصدیقِ قلب سے ہے تو وہ کبھی منحرف ہو ہی نہیں سکتا اس لیے اس سے ثابت قدمی کا طلب کرنا بے معنی سی بات ہے۔ بہر حال آیت زیر بحث میں "الذین آمنوا" سے رسمی ایمان مراد ہے جس کے باعث وہ مسلمانوں کے زمرہ میں شامل سمجھا جاتا اور مسلمان کہلاتا ہے اور "من آمن" میں جو ایمان ہے اس سے مراد حقیقی ایمان ہے



جو مدارِ نجاتِ اخروی ہے اس لیے اب یہ اشکال بالکل باقی نہیں رہتا۔

دوسرا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس آیت کو قرآن مجید کی دوسری آیات جو ایمان باللہ سے متعلق ہیں ان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو سرے سے کوئی اشکال اقم نہیں ہوتا۔ قرآن میں بار بار اسی حقیقت کو نہایت وضاحت سے اور مختلف اسالیب بیان میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ دین حضرت آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی ہے۔ فرق صرف شرائع اور مناسک کا ہے اور شریعت لاحقہ بہ نسبت شریعت سابقہ و مقدمہ کے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس بنا پر ایک شریعت کے بعد جب کوئی دوسری شریعت آجائے تو اب معمول بہ دوسری شریعت ہوگی نہ کہ پہلی۔ اس نظام اور ترتیب کے مطابق شریعت موسوی یہود کے لیے اسی وقت تک واجب العمل تھی جب تک شریعت عیسوی نہیں اتری تھی جب وہ آگئی تو اب اس پر عمل کرنا اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا ضروری ہو گیا۔ اسی طرح شریعت عیسوی کے بعد جب شریعت محمدی آگئی تو اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ کی شریعت پر عمل کرنا ضروری ہو گیا۔ چونکہ دعوت محمدی جو عالمگیر و ہمہ گیر ہے اس کی بنیاد دین اور شریعت کا یہ نظام ہی ہے اس بنا پر قرآن نے اس کو بڑی خوبی اور بلاغت سے جگہ جگہ بیان کیا ہے، اہل ان لوگوں کی سمجھت مذمت کی ہے جو دین میں اور انبیاء میں تفریق کرتے ہیں، یعنی ایک کو مانتے ہیں اور ایک کو نہیں مانتے، کسی کا اقرار کرتے ہیں اور کسی کا انکار۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب الہی ہے۔ اب خواہ کوئی یہودی ہو یا نصرانی، صابی ہو یا مجوسی بہر حال نجاتِ اخروی کے لیے ان دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ سورہ البقرہ میں ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُم آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا فَمَا نَنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ ط

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے (اب) جو کتاب نازل کی ہے اس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں ہم پر جو کتاب نازل ہو چکی ہے ہم تو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان کی کتاب کے بعد جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کو وہ نہیں مانتے گے حالانکہ یہ کتاب

سراسر حق ہے اور جو کتاب ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرنے والی بھی ہے۔

پس یہ آیت اور اس سلسلہ کی دوسری آیات، بلکہ سچ یہ ہے کہ پورے قرآن سے ہی یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ قرآن جہاں کہیں فقط ایمان کی یا ایمان باللہ کی یا ایمان باللہ والیوم الآخر کی دعوت دیتا ہے اس کی مراد ایمان کا وہ جامع تصور ہوتا ہے جس میں محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لانا شرط اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب زیر بحث آیت پڑھیے تو مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا کوئی گنجشک باقی نہیں رہتا۔ یعنی یہ کہ رسمی مسلمان ہو یا یہودی یا عیسائی یا صابی، اس میں سے جو بھی سچ (قرآن کی تعلیمات کے مطابق) اللہ اور یوم الآخر پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح کرے گا اس کے لیے اللہ کے پاس اس کا اجر ہو گا۔

صلوات کون ہیں؟

لیکن افسوس ہے مفسرین نے اپنی عادت کے مطابق اس آیت کی تفسیر بھی اس طرح کی ہے کہ بات کچھ ابھی جاتی ہے، مثلاً طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ انہوں نے پہلے آیت زیر بحث "ولائم یجزون" تک تلاوت کی اور فرمایا اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ دوسری آیت نازل کی "ومن یتبع غیر الاسلام دینا قلن لعل منہ وہو فی الاخرۃ من الخاسرین" (سورہ آل عمران: ۸۵) اس اثر کو نقل کرنے کے بعد طبری لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے عبداللہ بن عباس کی ماٹھے یہی تھی کہ اس آیت میں اللہ نے پہلے وعدہ کیا تھا کہ یہود، نصاریٰ اور صابی ان میں سے جو بھی عمل صالح کرے گا (اسلام کو قبول کیے بغیر اللہ آخرت میں اس کو جنت عطا فرمائے گا لیکن اس کے بعد "ومن یتبع" والی آیت نازل فرما کر اس آیت کو منسوخ کر دیا نیز اس موقع پر طبری نے مشہور تابعی مفسر سدی سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں موصوف حضرت سلمان فارسی کے قبول اسلام کا واقعہ نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت سلمان نے خود سلمان ہو جانے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان ساتھیوں کی نسبت دریافت کیا جنہیں وہ بیت المقدس کے گرجا میں چھوڑ کر تھے اور کہا حضور! میرے ساتھی روز رکھتے اور نماز پڑھتے تھے اور آپ پر (فانہ) ایمان لائے ہوئے تھے (بقیہ صفحہ ۶ پر دیکھیے)

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ صابئون کون لوگ مراد ہیں؟ افسوس ہے اس بارے میں بھی مفسرین کے اقوال اتنے ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں۔

مفسرین کے آرا:

”صابئون جمع صابی کی ہے اور صابی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنا دین ترک کر کے کوئی

(فقہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کیونکہ وہ آپ کے مبعوث ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ لوگ دوزخی ہیں“ سلمان کو یہ سن کر بڑا دکھ ہوا اور عرض کیا: ”اگر یہ لوگ آپ کی بعثت کا زمانہ پالیتے تو بے شبہ آپ کی تصدیق کرتے اور آپ کے پیرو ہوتے“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد طبری نے مجاہد سے بھی ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہی ہے البتہ اتنی بات زائد ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کو بلایا اور فرمایا: ”تمہارے ساتھیوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے“ اور اس کے بعد مزید فرمایا: ”جو شخص میری دعوت سننے سے پہلے دین عیسیٰ اور اسلام پر مرادہ اچھی حالت میں ہے مگر جس شخص نے میری دعوت کو سنا اور مجھ پر ایمان نہیں لایا وہ ہلاک ہوا“ (جلد ۱۲ صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۱۵۵) لیکن احمد محمد شاہ جھنڈ نے طبری کی احادیث کی تخریج کی اور ان پر حاشی لکھے ہیں مذکورہ بالا دو روایتوں کو منقطع بتاتے ہیں اس لیے ظاہر ہے ان پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر دونوں روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اب تین اعتراض وارد ہوتے ہیں ایک یہ کہ جب معاملہ ان لوگوں کا تھا جن کو دعوت محمدی نہیں ملی اور ان کا خاتمہ اپنے مذہب کے مطابق ایمان اور عمل صالح پر ہوا تو آیت میں ان کے ساتھ ان لوگوں کو کیونکر ذکر کیا ہے جن کو دعوت محمدی پہنچی اور انھوں نے اسے قبول کیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آیت کے مضمون کو دو سورتوں ”البقرہ اور المائدہ“ میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت سلمان فارسی کے سوال کا جواب ایک آیت سے ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی تکرار کی وجہ کیا ہے؟ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ جن لوگوں کو دعوت محمدی نہیں پہنچی اور ان کا خاتمہ اپنے مذہب کے مطابق ایمان بالذات اور عمل صالح پر ہوا آخرت میں ان کی مغفرت کا معاملہ تو بالکل واضح تھا۔ پھر حضور کا یہ فرمانا کہ وہ دوزخی ہیں کس پر محمول کیا جائے گا؟

اور دوسرا دین اختیار کر لے۔ مثلاً وہ شخص جو اسلام سے مرتد ہو جائے۔ عرب ہر ایسے شخص کو صابی کہتے تھے۔ اب اختلاف اس بات میں ہے کہ آیت میں جن لوگوں کو صابون کہا گیا ہے وہ کون ہیں؟ بعض کہتے ہیں "اس کا مصداق وہ تمام لوگ ہیں جو ایک دین کو ترک کر کے کوئی اور دین اختیار کر لیں" اس کے برخلاف بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا کوئی دین نہیں۔ مشہور مفسر مجاہد سے مروی ہے کہ صابون نہ یہود ہیں اور نہ نصاریٰ اور ان کا کوئی دین نہیں ہے۔ مجاہد سے ایک دوسری روایت حجاج بن ارطاة کی یہ ہے کہ صابون مجوس اور یہود کے درمیان ایک طبقہ کا نام ہے، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ حسن بصری اور ابن ابی نجیح سے بھی یہی مروی ہے لیکن ابن زید کی رائے یہ ہے کہ جزیرہ موصل میں کچھ لوگ آباد تھے جو کسی دین کو ماننے لگے اور لا الہ الا اللہ کہتے تھے مگر ان کے پاس نہ کوئی عمل ہے اور نہ یہ کسی پیغمبر یا کتاب کو ماننے ہیں، چند مفسرین کی رائے ہے کہ یہ لوگ فرشتوں کی پوجا کرتے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ زیاد بن ابیہ جو حضرت امیر معاویہ کے نکلنے میں عراق کا گورنر تھا اس نے یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان سے جزیرہ ساقط کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر پھر اسے بتایا گیا کہ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ قتادہ جو مشہور مفسر ہیں ان سے بھی یہی قول مروی ہے مگر اس میں اتنی بات زیادہ ہے کہ یہ لوگ زبور کی بھی تلاوت کرتے تھے، ابو العالیہ کی رائے ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب تھے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابو جعفر الرازی سے بھی یہی منقول ہے۔ سدی سے کسی نے پوچھا تو جواب دیا "یہ لوگ اہل کتاب میں سے ہیں"۔

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ صابون دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو صابون حنفیہ کہلاتے اور دوسرے مشرکین تھے۔ یہ دوسرا طبقہ ستارہ پرست تھا اور یہود و نصاریٰ کی طرح ان کے بھی عبادت خانے ہوتے تھے۔ مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لفظ صبا صبا سے مشتق ہے جس کے معنی مائل و راغب ہونے کے ہیں۔ اسی مناسبت سے طلوع

کرنے کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ”عبات النجوم“ یا ”صبا علینا فلان“ بمعنی طلعت وطلع، اور طلوع کے معنی میں چونکہ خروج کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے جو شخص اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لیتا تھا، اسے صابی کہتے تھے۔ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ”الصباة“ کہتے تھے اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان لوگوں کے خیال میں آپ نے اور صحابہ نے اپنا دین ترک کر دیا تھا۔ بنو جذیمہ جب مسلمان ہو گئے تو کہتے تھے ”عبانا صباة“ بعض حضرات کا خیال ہے کہ صابی حضرت نوح کے دین کے پیرو تھے۔ بعض حضرات نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ان لوگوں کو حضرت نوح کے چچا صابی کے ساتھ نسبت تھی اس لیے یہ بھی صابی کہلانے لگے اور نیز یہ کہ ”صابی“ عجمی زبان کا اسم علم ہے۔

مورخین اور دیگر حضرات:

اب مفسرین کے علاوہ مورخین اور دوسرے علما اور مصنفین کے بیانات کو دیکھا جائے تو اگرچہ انھوں نے بعض نئی باتیں کہی ہیں مگر اختلاف اور تردد و تذبذب یہاں بھی ہے اور اس بنا پر کسی قطعی نتیجہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ شاہ فارس طہمورت کے اوائل عہد سلطنت میں جب لوگ عام طور پر بت پرستی اور کواکب پرستی میں مبتلا تھے، بوداسف نامی ایک شخص ارض ہند میں ظاہر ہوا اور یہ ہندی ہی تھا بھی۔ اس نے پنیریری کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں خدا کا فرستادہ اور اس کے بندوں اور اس کے درمیان ایک واسطہ ہوں۔ یہ بوداسف پہلا شخص ہے جس نے صابہء طور طریق کی بنیاد ڈالی ہے۔

آگے چل کر لکھتا ہے ”حرانی صابہء کے مختلف ہیکل (عبادت خانہ) تھے جو عقل اول

۱۔ النہایہ ج ۲ ص ۲۲۸

۲۔ لسان العرب ج ۱ لفظ صبا

۳۔ تاج العروس ج ۱ ص ۸۷ و تاریخ ابن خلدون ج ۵ ص ۲۰

۴۔ مروج الذهب مطبوعہ نصر ۱۹۵۸ جلد دوم ص ۲۳۷

۵۔ حران صوبہ جزیرہ کا بہت قدیم اور مشہور شہر تھا تیرھویں صدی عیسوی کے ختم تک آباد رہا مشہور مورخ ابو الفدا متوفی ۱۳۳۲ء کے عہد میں ویران ہو گیا۔ اب اس جگہ ایک عجمی ساٹھاؤں ہے جہاں عہد قدیم کی عمارتوں کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔

اور مختلف اجرامِ علویہ و طبعیہ کے نام پر ہوتے تھے۔ مشہور طبیب ابو بکر محمد بن زکریا رازی نے حرانی صابون کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی۔ مسعودی کا بیان ہے کہ اس نے یہ کتاب پڑھی تھی اور اس میں ان لوگوں کی نسبت ایسی ایسی باتیں درج ہیں جنہیں بیان کرنا بھی بہت سے لوگوں کو برا معلوم ہوگا۔ حرانی صابون کے مقابلے میں انہیں کا دوسرا گروہ ہے مسعودی نے اس کا نام کیمار یون بتایا ہے۔

مسعودی نے جو بات کہی ہے بعض مورخین نے اسی کو الٹ پلٹ کر یا کسی تیسرے کسی پیشی کے ساتھ کہا ہے۔ چنانچہ ابو ریحان البیرونی (ولادت ۳۹۲ھ) نے "الآثار الباقیہ" میں "درعیان نبوت" کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔ اس کے تحت لکھا ہے کہ ان درعیان نبوت میں پہلا شخص بودایت ہے۔ یہ بادشاہ طہمورث کی حکومت میں پہلے سال ہند میں ظاہر ہوا اور لوگوں کو ملت صابونہ کی دعوت دی۔ اس دعوت کو بہت سے لوگوں نے قبول کیا۔ اب انہیں لوگوں کے بچے کھچے جو حران میں پائے جاتے ہیں اس مقام کی نسبت سے حرانی کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا مسلک کیا تھا؟ اس سلسلہ میں بیرونی نے پہلے دوسرے لوگوں کے بیانات نقل کیے ہیں، جن میں اس فرقہ کی طرف بعض نہایت محسوس اور گندی باتیں منسوب کی گئی ہیں اور پھر خود اپنی معلومات کی روشنی میں کہتا ہے:-

"مگر ہم تو ان کی بابت ہی جانتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کی توحید کے قائل ہیں۔ اس کو تبارک سے منزه مانتے ہیں اور ان کے ہاں جتنے صفات باری ہیں وہ سب ہی ایجابی نہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وہ نظر نہیں آسکتا۔ وہ ظلم نہیں کرتا اور نہ اس پر کوئی ظلم کر سکتا ہے۔ یہ لوگ باری تعالیٰ کے لیے اسما حسنی ثابت کرتے ہیں مگر مجازاً، کیونکہ ان کے نزدیک باری تعالیٰ کے لیے درحقیقت کوئی صفت نہیں ہے۔ عالم میں جو کچھ تغیرات و تبدلات

۱۔ مروج الذهب ج ۲ ص ۲۴۷

۲۔ مروج الذهب ج ۲ ص ۲۵۰

۳۔ مطبوعہ پلنگ، ۱۸۷۸ء ص ۲۰۲ و ۲۰۵

ہوتے رہتے ہیں یہ لوگ ان کو آسمان اور اجرام علویہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

جامع دمشق میں مقصورہ کے قریب محراب کے اوپر جو گنبد بنا ہوا ہے وہ انہیں کے آثار میں سے ہے۔ جس زمانے میں یونانی اور رومی مذہب صابئہ کے پیرو تھے اس زمانہ میں یہ ان کا عبادت گاہ تھا۔ جب یہود کا زور ہوا تو انہوں نے اس کو اپنا عبادت خانہ بنا لیا۔ پھر نصاریٰ کا عہد آیا تو یہ عمارت گرجا میں اور آخر میں اسلام آیا تو یہ مسجد کی شکل میں منتقل ہو گئی۔

شہرستانی (المتوفی ۵۴۸ھ) نے بوداسف کا نام تو نہیں لیا، لیکن یہ ضرور لکھا ہے کہ صابئہ فرقہ ظہورث کی حکومت کے پہلے سال میں ظاہر ہوا ہے۔ مگر اس فرقہ کے عقائد و اعمال کیا ہیں؟ اس کے متعلق شہرستانی نے بھی کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ مختلف اقوال نقل کر دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صابئہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو کسی کتاب کو نہیں مانتے لیکن حدود و احکام (یعنی حلال و حرام) کے قابل ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں: "ضیغیت صبوءہ کے مقابل ہے آگے چل کر اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "صابئہ کو عالم ارواح و مجردات میں زیادہ یقین ہوتا ہے۔ اور اس کے برخلاف حنفا کا اعتقاد جسمانی بشر (یعنی انبیا و رسل) میں ہوتا ہے۔ حنفا اور صابئوں میں یہ بنیادی سبب اختلاف بتانے کے بعد شہرستانی نے تقریباً تیس صفحوں میں ان دونوں فرقوں کے مناظرے نقل کیے ہیں جو بڑے دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔ ان سب سے قطع نظر ایک مقام پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اہل ہند میں کچھ لوگ ملت

۱۔ عقائد باقیہ ۱۸۷۸ء ص ۲۰۵

۲۔ کتاب الملل و النحل مطبوعہ لیزنگ ۱۹۲۳ء جلد ۲، ص ۱۸۵

۳۔ ایضاً جلد اول ص ۲۴ و جلد دوم ۲۰۲

۴۔ ایضاً جلد اول ص ۲۶۔ جلد دوم ص ۲۰۳

۵۔ ایضاً جلد ۲، ص ۲۰۳

ابراہیمی کے قائل ہیں اور ان میں اکثر مذہب صابئہ رکھتے ہیں۔  
 اصل یہ ہے کہ قدیم اسلامی مورخین میں یہ مشہور ہے کہ ہندوستان کے برہمن چونکہ اپنے  
 آپ کو حضرت ابراہیم کی طرت منسوب کرتے ہیں اس لیے وہ برہمن کہلاتے ہیں اور یہ کچھ مسلمان  
 مورخین کے ساتھ مخصوص نہیں ہندوؤں میں بھی اس خیال کے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ  
 دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ ہندی و سنسکرت مہا مہوپادھیائنت لکشمی دھرنے عرصہ  
 ہوا اور ٹیل کا نفرنس کے کسی ایک سیشن میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں انہوں نے یہ  
 ثابت کرنا چاہا تھا کہ حضرت ابراہیم جنوبی ہند کے کسی مقام پر پیدا ہوئے تھے اور ڈراوڈ  
 نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بہر حال شہرستانی نے جو آخری قول نقل کیا ہے اس میں ہمارے  
 نزدیک ابراہیمی کے قائل جن لوگوں کو کہا گیا ہے ان سے مراد برہمن ہیں جس کی جمع  
 عربی میں براہیمہ آتی ہے اور لوگوں کو مذہب صابئہ کا پیر بتایا گیا ہے وہ بدھست (بودا  
 یعنی گوتم بدھ کے پیر) ہیں۔

بوداسف کون ہے؟

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے عرب مورخین کی عام رائے یہ ہے کہ فرقہ صابئہ کی داغ  
 بیل بوداسف نے ڈالی تھی اور وہ ہندی تھا۔ لیکن یہ بوداسف سے کون؟ اگرچہ البیرونی  
 نے ایک ضعیف قول یہ نقل کیا ہے کہ بوداسف سے مراد ہرس ہے مگر خود ہرس کی شخصیت  
 مختلف فریہ ہے بعضوں کے نزدیک ہرس حضرت ادریس کا نام ہے جن کو توراہ اخنوخ  
 کہا گیا ہے اور بعض حضرات کا خیال تھا کہ یونان کا ایک بڑا فلسفی تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے  
 کہ عرب جب بوداسف بولتے ہیں تو ان سے مراد گوتم بدھ ہی ہوتا ہے اگرچہ گوتم بدھ کے لیے  
 کبھی بد یا بدھ کے الفاظ کے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے  
 فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے بوداسف براہ راست بدھا کی تعریف نہیں ہے۔ بلکہ بودھی

۱۔ کتاب الملل و النحل مطبوعہ لہور جلد ۲، ص ۲۲۲

۲۔ آثار الباقیہ ۲۰۶

۳۔ قدیم ایڈیشن ج ۱ ص ۷۰، لفظ بدھ



کا معر ب ہے۔ یہ پالی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "علم و معرفت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی ہستی" لوگ اعزاز و اکرام کے طور پر گوتم بدھ کو بدھی مت (BODHISATTVA) کہتے تھے۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاں تک عرب مورخین کا تعلق ہے ان کا عالم رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جن کو صابٹون کہا گیا ہے وہ گوتم بدھ کے پیر و معنی بدھ ہیں۔ ہمارے زمانہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی رائے بھی یہی تھی۔ چنانچہ مولانا نے "معارف" اعظم گڑھ کی دو اشاعتوں (فروری و مارچ ۱۹۵۳ء) میں ایک مقالہ اسی موضوع پر لکھا تھا اور اس میں اپنے مخصوص انداز تحریر میں یہی ثابت کرنے کی کوشش تھی کہ صابٹون اور بدھ ایک ہیں۔ ان کے جواب میں مولانا مرحوم کے ہی رفیق کار مولانا سید فضل اللہ نے اگست ۱۹۵۳ء کے "معارف" میں ایک مقالہ شایع کیا جس میں مولانا گیلانی کے نظریہ یا تحقیق کی تردید کرتے ہوئے بودا سٹ کے بدھا ہونے سے انکار کیا گیا تھا۔

اصل یہ ہے۔ جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے عرب مورخین گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات سے باخبر تو ہیں لیکن گوتم بدھ کا عہد کونسا تھا؟ اس بارے میں ان کی معلومات بہت ناقص ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ عرب مورخین کا کیا قصور! جب خود بودھی مت کے علماء ہزار کوشش کے باوجود اس سلسلے میں کوئی قطعی اور متفقہ بات نہیں کہہ سکے۔ اب آخری تحقیق یہ ہے کہ گوتم بدھ کی پیدائش حضرت عیسیٰ سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ہوئی تھی۔ بہر حال عربوں کو نہ بدھا کے عہد کا صحیح علم تھا اور نہ وہ ان کی تعلیمات سے صحیح طور پر واقف تھے۔ چنانچہ شہرستانی جس کی بودھی مت سے واقفیت "الہند" کے مصنف بیرونی سے بھی زیادہ ہے، اس تک نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا بدھا جو دنیا میں ظاہر ہوا، اس کے ظہور اور ہجرت نبوی میں پانچ ہزار برس کی مدت کا فاصلہ ہے۔ شہرستانی نے اس بدھا کا نام شاکمین بتایا ہے جو گوتم کے لقب سکیا مونی (SAKYAMUNI) کی عربی شکل ہے۔

۱۔ جلد اول ص ۷۷

۲۔ المسئل وہ لسنل ج ۲ ص ۲۶

۳۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس ج ۲ ص ۸۸۱

اس کے بعد شہرستانی کا بیان ہے کہ ایک اور بدھا ہوا جس کا نام بودیسیہ تھا۔ یہ بودیسیہ اسی لفظ بوداست کی تعریب ہے جس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں اور یہ دراصل کسی اور بدھا کا نہیں بلکہ خود گوتم بدھ کا لقب تھا۔ بہر حال اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرب مورخین کی معلومات اس معاملہ میں کس درجہ ناقص اور غلط ہیں۔ اس بنا پر اگر ان مورخین نے ایران کے پیشدادی خاندان کے بادشاہ ظہور شاہ خود جس کی زندگی ایک افسانہ ہے اس کی حکومت کے پہلے سال میں "بوداسف" کا ظہور بتا دیا ہے، تو محض اس سے یہ نتیجہ نکالنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "بوداسف" بدھا کے علاوہ کوئی اور دوسرا شخص ہے۔ حق یہ ہے کہ عرب مورخین کے نزدیک بوداسف سے مراد مہاتما گوتم بدھ ہیں اور وہی ان کے خیال میں فرقہ "صابئہ" کے بانی ہیں۔

عام ارباب تفسیر ہوں با ارباب تاریخ کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ خود قرآن مجید سے صابئوں کی کن خصوصیات و اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔ ورنہ اختلاف و تنوع آرا کا دائرہ ہرگز اس قدر وسیع نہیں ہو سکتا تھا اور نہ اس فرقہ کی تعیین کے سلسلے میں کوئی ایسی بات سے نکلتی جس کی تردید قرآن سے ہوتی ہے۔ اور واقعی ایک فاضل مستشرق کے بقول یہ امر کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ قرآن میں جس فرقہ کا ذکر مسلمانوں اور مشہور اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے پہلو پہ پہلو کیا گیا تھا۔ ارباب تفسیر و تاریخ اس کی صحیح اور قطعی نشاندہی سے قاصر رہے ہیں۔

**صابئوں کی خصوصیات قرآن کی روشنی میں:**

قرآن میں اس فرقہ کا ذکر تین جگہ آیا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۶۲، المائدہ آیت ۶۹ اور الحج آیت ۱۷ میں۔ ان تینوں مقامات کو یکجا فی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل نتائج صاف طور پر نکلتے ہیں۔

(۱) صابئہ مشرک نہیں تھے، کیونکہ سورۃ الحج میں ان کو مشرکین کے بالمقابل ایک قسم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے :-

ان الذین آمنوا الذین ہادوا  
والصائبین والنصری والمجوس والذین  
اشراکوا ان الله یفضل بنیہم یوم القیامۃ  
ان الله علی کل شیء شہید

بے شبہ مومن، یہود، صابی، نصاریٰ، مجوسی  
اور مشرک، اللہ قیامت کے دن ان میں امتیاز  
کرے گا۔ بے شبہ اللہ ہر چیز کا دیکھنے  
والا ہے۔

اس آیت میں یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ صابین کو ترتیب میں  
تیسرے نمبر پر یعنی نصاریٰ سے بھی پہلے رکھا گیا ہے۔

(۲) صابی اہل کتاب تھے، کیونکہ مشرکین کے علاوہ جتنے لوگ باقی رہ جاتے  
ہیں وہ سب ”وما من امة الا خلا فیہا خذیر“ کے ارشاد کے مطابق اہل کتاب ہیں  
اس بات کا قومی قرینہ یہ بھی ہے کہ ان کو اہل کتاب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ  
کا اہل کتاب ہونا تو ظاہر ہی ہے، مجوس کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے اہل کتاب کا معاملہ  
کیا ہے، علاوہ ازیں سورہ البقرہ اور سورہ المائدہ کی آیتوں کا سیاق بتا رہا ہے کہ ”من  
آمن باللہ سے پہلے جو چار طبقات بشمول صابئہ بیان کیے گئے ہیں وہ کسی دین سماوی  
کسی نہ کسی شکل میں پیرو ہیں اور اس لیے ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر ان سے  
متوقع ہیں۔“

(۳) معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے اس بنا پر ان آیات  
سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صابئہ ایک مستقل بالذات اور ممتاز فرقہ تھا۔ یہ نہیں تھا جیسا کہ بعض  
حضرات نے لکھا ہے کہ وہ یہود یا نصاریٰ کی ایک شاخ ہوں۔

ان تنقیحات کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل اقوال و آراء جو آپ اوپر  
پڑھ چکے ہیں قرآن سے خود بخود ان کی تردید ہو جاتی ہے:

(الف) صابئہ کا کوئی دین نہیں تھا۔

(ب) یہ لوگ مشرک تھے اور فرشتوں و ارواح وغیرہ کی عبادت کرتے تھے۔

(ج) صابون ان سب لوگوں کو کہتے ہیں جو ایک دین ترک کر کے کوئی دوسرا دین اختیار کر لیں۔

(د) صابون دو قسم تھے۔ ایک حنفا اور دوسرے مشرکین۔ اس قول کی تردید کی وجہ یہ ہے کہ جو فرقہ اصلاً اہل دین یا اہل کتاب کی حیثیت سے معروف ہو جاتا ہے اس کے کچھ افراد اگر مشرکانہ اعمال و افعال کرنے بھی لگیں تو اس سے فرقہ کی دو قسمیں نہیں ہو جاتیں۔ جب تک کہ وہ لوگ اس فرقہ سے اپنا تعلق منقطع کرنے کا اعلان نہیں کرتے فرقہ کی اعتبار سے غیر مشرک ہی کہلائیں گے۔

صابون بودہ مت کے پیرو نہیں ہو سکتے :-

مذکورہ بالا اقوال مفسرین کے تھے۔ اب مورخین کا قول یعنی یہ کہ بودہ مذہب کے پیرو صابون ہیں، اس پر غور کیا جائے تو قرآن سے صاف طور پر اس کی تردید بھی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے وجہ یہ ہیں۔

(۱) گوتم بدھ کے یہاں نہ خدا کا تصور ہے اور نہ یوم آخرت کا اور اس بنا پر پیغمبری کا بھی اس مذہب میں کوئی تصور نہیں۔

(۲) گوتم بدھ کے مذہب کو قرآن کی اصطلاح کے مطابق ہم دین نہیں کہہ سکتے۔

(۳) گوتم بدھ اور ان کے پیرووں کے متعلق عرب مورخین کا یہ بیان غلط ہے کہ گوتم بدھ نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔ اور یہ لوگ توحید کے قائل تھے۔

(۴) عرب مورخین لکھتے ہیں کہ صابون تین وقت کی نماز مسلمانوں کی طرح پڑھتے تھے۔ ان کے ہاں حلال و حرام کے احکام بھی مسلمانوں کے احکام سے ملتے جلتے تھے۔ اگر مورخین کے مطابق یہ صابون کی صحیح تصویر ہے تو اس کا مصداق بودہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے ہاں نہ قبلہ و نماز کا پتہ کا اور نہ ان کے احکام مسلمانوں کے احکام سے مماثلت رکھتے ہیں۔ مسعودی نے ابو بکر محمد بن زکریا الرازی کی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جسے مسعودی

نے خود دیکھا ہے اور جس میں حرانی صابہ کے مذاہب بیان کیے گئے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مازنی نے جو یہ مذاہب بیان کیے ہیں وہ کیا ہیں؟ البتہ خود مسعودی نے ان لوگوں کا مذہب کو اکب اور جو اہرقلیہ کی پرستش بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مازنی نے بھی یہی لکھا ہو گا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ لوگ بھی یقیناً قرآن کے صابہ نہیں ہیں۔

عہد حاضر کے علماء نے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن متقدمین نے جو کچھ لکھا ہے ان حضرات نے بھی اسی کو الٹ پلٹ کر نقل کر دیا ہے چنانچہ سید محمود شکاری الاکوسی اپنی فاضلانہ کتاب بلوغ الأرب میں لکھتے ہیں:

”یہ لوگ حران میں تھے اور یہ مقام صابہ کا مرکز تھا۔ ان میں دو گروہ تھے۔ ایک حنفا کا اور دوسرا مشرکین کا۔ ان میں جو مشرک تھے وہ سب سے زیادہ اور ان کے بروج کی پرستش کرتے تھے اور ان کا ہیکل بنا کر رکھتے تھے۔۔۔ ان ستاروں کی عبادت کرنے کے طریقے مختلف تھے۔ یہ ان کے بت بھی بنا کر رکھتے، ان کے نام کی قربانی کرتے اور مسلمانوں کی طرح پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتے تھے ان میں کچھ گروہ تھے جو ماہ رمضان کا روزہ بھی رکھتے کعبہ کی تعظیم کرتے اور حج کے بھی قابل تھے۔ ان کے ہاں کھانے پینے کی چیزوں میں اور نکاح کے معاملہ میں حلال و حرام کے احکام وہی تھے جو مسلمانوں کے ہاں ہیں“

مذکورہ بالا باتیں سب وہی ہیں جو مورخین نے لکھی ہیں۔ البتہ ایک نئی بات یہ بھی لکھی گئی ہے کہ ”یہ لوگ حضرت ابراہیم کی قوم اور آپ کے اہل دعوت تھے“ لیکن اس کے بعد فاضل موصوف نے جو تفصیلات لکھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک بھی صابہ، یہود اور نصاریٰ اور مجوس کی طرح کسی ایک خاص فرقہ کا نام نہیں ہے جس کے مخصوص عقائد و اعمال ہوں۔ بلکہ صابہ مختلف فرقوں اور گروہوں کا نام ہے جن کے درمیان اختلاف عقائد و افکار کے باوصف صرف

۱۔ مروج الذہب جلد ۲ ص ۲۵۰

۲۔ بلوغ الأرب جلد دوم ص ۲۲۳

۳۔ بلوغ الأرب جلد دوم ص ۲۲۳

ایک مشترک امر یہ ہے کہ یہ لوگ کسی ایک خاص دین اور مذہب کے پابند نہیں ہیں جس کسی مذہب اور مسلک دینی میں انھیں کوئی اچھی بات نظر آئی ہے اسے قوالاً و عملاً اختیار کر لیتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا نام صابئہ ہے۔ چنانچہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد موصوف کہتے ہیں: "غرض کہ صابئہ کے بہت سے فرقے اور گروہ ہیں۔ ایک فرقہ حنفا کا اور دوسرا مشرکوں کا تیسرا فلاسفہ کا اور ایک فرقہ بالکل آزاد لوگوں کا۔ یہ سب لوگ عجیب معجون مرکب ہیں۔ ان میں کوئی نبوت کا قائل ہے اور کوئی منکر۔ کوئی توحید کو مانتا ہے اور کوئی مشرک ہے" جیسا کہ ہم اوپر بتائے ہیں قرآن میں جن لوگوں کو صابئہ کہا گیا ہے وہ یہود اور نصاریٰ کی طرح ایک مستقل فرقہ ہیں اور اہل کتاب ہیں اس لیے آوسے جن کو صابئہ کہتے ہیں وہ یقیناً قرآن کے صابئہ نہیں ہیں۔

مستشرقین :-

مستشرقین نے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور جنس نے تو اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے چولسن (CHWOLSAN) نے جرمنی زبان میں "فرقہ صابئہ اور صابئیت" (DIE SCABIER UND DER SCABISMUS) کے نام سے ایک کتاب ۱۸۵۶ء میں لکھی۔ یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔ لیکن یہ کس پایہ اور مرتبہ کی کتاب ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جھوس پیڈرسن (JOHS PEDERSEN) جس نے خود صابئہ پر ایک فاضلانہ مقالہ لکھا ہے چولسن کی کتاب کے متعلق لکھتا ہے "یہ کتاب اس موضوع پر بنیادی سے زیادہ ہے اور اس میں مصنف نے اپنا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اس مضمون کے طلباء میں اب تک وہی مقبول ہے۔ اس کتاب میں کیا ہے؟ اسے بھی موصوف کی زبان سے سینے۔ لکھتے ہیں :-

چولسن کی تحقیقات کے نتائج حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب "دوغنائتین" (REFUTATION OF HERESIUS) (جو موجودہ تحقیقات کی

۱۱ بلوغ اللاب ۲ ص ۲۲۵

۱۲ عجب نامہ ص ۳۸۳

روشنی میں ہپولیس (HIPPOLYTUS) متوفی ۶۲۳۵ سے منسوب کی جاتی ہے) میں بیان کیا گیا ہے کہ انخسائی نام کا ایک شخص پر تھیا سے ایک کتاب لے کر آیا جس کی نسبت اس کا دعویٰ تھا کہ اس پر ایک فرشتہ نے نازل کی ہے اور اس نے وہ کتاب ایک شخص کے حوالے کی جس کا نام صوبیہ تھا۔ اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ صابیہ اسی کی طرف منسوب تھے اور یہ صابیہ وہی ہیں جنہیں منڈینس کہا جاتا ہے۔

(۲) اس فرقہ کی نسبت ابن ندیم فرست میں لکھتا ہے "واسط اور بصرہ کے درمیان جو ترائی کا میدان ہے اس میں ایک فرقہ پایا گیا ہے جس کا نام المغتسلہ ہے اس فرقہ کا نام صحیح تھا۔

(۳) یہ صابیہ (منڈینس) وہی ہیں جن کا ذکر قرآن میں تین مقامات پر آیا ہے جیسا کہ نور برگ (NORBERG) اور میخائیل (MICHAELIS) کا قیاس ہے۔ یہ نام آرامی زبان کے لفظ (YIY) سے مشتق ہے جس کے معنی غوطہ لگانا ہیں۔

(۴) پھر ان ہی لوگوں میں مانویہ پیدا ہوئے کیونکہ مانی کا باپ فتاق جب اس کی بیوی حاملہ تھی، ان لوگوں میں آسا تھا۔ غرض کہ خلاصہ یہ ہے کہ یہ صابیہ وہی ہیں جن کو عرب مورخین مغتسلہ کے نام سے جانتے ہیں اور یہی منڈینس کہلاتے ہیں۔ منڈینس یا عرب مورخین کے مغتسلہ قرآن کے صابیہ ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ اس سے پہلے یہ معلوم کر لیجئے کہ دوسرے مستشرقین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اسپرنگر نے مروج الذہب کے انگریزی ترجمہ کی جلد اول میں لکھا ہے کہ قدیم مستشرق ہوننگر (HOTTINGER) نے بھی اپنی کتاب (HISTORIA ORIENTALIS) کی جلد اول کے آٹھویں باب میں صابیہ مذہب سے مستقل اور مفصل بحث کی ہے۔ لیکن اس ساری بحث کا دار و مدار ابن ندیم کی الفہرست ہی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر اسپرنگر کے بقول مصنف کو نہ کتاب کا نام صحیح معلوم تھا اور نہ اس کا علم تھا کہ مصنف (ابن ندیم) کس عہد سے تعلق رکھتا تھا۔

۱۷ عجب نامہ ص ۳۸

۱۷ ایضاً ص ۲۱۷

رجرڈ بیل لکھتا ہے: "میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جنوبی عرب کے عیسائی جو شمالی عرب کے عیسائیوں سے جن کو نصاریٰ کہا جاتا ہے بالکل ممتاز تھے انھیں کو صابی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ شہر سبا کے باشندے تھے اس لیے "س" "ص" سے بدل گیا اور یہ صابی کہلانے لگے لیکن موصوف کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ عربی زبان میں سین اور صاد کا فرق معمولی نہیں ہے اس لیے ایک دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ ممکن ہے اس سے مراد الکساپون ہوں جن کے بچے کھچے لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں عرب کے شمالی مغربی حصہ میں پائے جاتے تھے"۔

ان توجیہات میں سے پہلی توجیہ کی رکاکت کو خود مصنف نے تسلیم کیا ہے۔ رہی دوسری توجیہ تو اس کے متعلق گزارش یہ ہے کہ الکساپون (ELKISAITS) کا فرقہ جو الکسانی نامی ایک شخص کی طرف منسوب ہے اور جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر یا دوسری صدی کے اوائل میں وادی اردن میں ظاہر ہوا تھا اگرچہ توحید کا قائل تھا اور بتوں کے نام پر جو جانور ذبح ہوتے تھے ان کو حرام قرار دیتا اور بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا تھا لیکن اول تو یہ فرقہ یہودیت کی ایک شاخ تھا۔ اور اس کے علاوہ جس شخص کی طرف یہ منسوب ہے اسے اگرچہ خود صاحب کتاب ہونے کا دعویٰ تھا لیکن کسی حدیث یا کسی اثر و خبر سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پیغمبر اور اس کی کتاب کو آسمانی کتاب مانتے تھے۔ بلکہ پورے ذخیرہ احادیث و آثار میں اس کا نام تک کہیں مذکور نہیں ہے۔ اس بنا پر الکساپون کا مصداق اس فرقہ کو قرار دینا محض دور از کار اور بعید از قیاس بات ہے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر اسپرنگر نے ایک عجیب مضحکہ انگیز بات کہی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ کے تذکرہ میں ہے "وَاتَيْنَاهُ الْحِكْمَ صَبِيًّا" ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں صحیح قرأت بجائے "صَبِيًّا" کے "صَابِيًّا" ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں اعراب بشمول الف توبعد میں لگی ہیں اس لیے موصوف کا خیال ہے کہ اگر اصل میں لفظ "صَابِيًّا" ہوا اور بعد میں



وہ صبیاً ہو گیا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ کو (JOHN THE BAPTIST) کہا جاتا ہے اور شامی زبان میں بیپٹسٹ کا ترجمہ "صابی" ہے۔ یہ مطلب یہ ہے کہ جو فرقہ صابیہ کے نام سے معروف ہے وہ حضرت یحییٰ کا پیرو اور ان کی امت ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے جو رائے ظاہر کی ہے وہی رائے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کراؤڈے وو (B. CARRADEVANX) کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"صابیوں" دو مستقل الگ الگ فرقوں کا نام ہے (۱) منڈینس (MANDAENS) یا صبیاً (LUBBAS) منڈینس یونانی زبان کا لفظ ہے اور معنی ہیں "اہل معرفت" جنہیں انگریزی میں (Gnostics) کہتے ہیں۔

یہ عراق کا ایک نیم یہودی اور نیم عیسائی فرقہ تھا جسے حضرت یحییٰ کا پیرو (CHRISTIANS OF JOHN THE BAPTIST) کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ بتسمہ کی رسم ادا کرتا تھا اور (۲) دوسرے حرانی یہ ایک بیدین (PAGAN) فرقہ تھا جو اسلام کے زیر سایہ عرصہ تک قائم رہا۔ قرآن میں جن صابیوں کا ذکر اہل کتاب یعنی اور نصاریٰ کے ساتھ آیا ہے اس سے بظاہر پہلا فرقہ یعنی پیروان حضرت یحییٰ مراد ہے۔ اور یہ نام عبرانی زبان کے لفظ "صبع" (S.B.) جس کے معنی غوطہ لینا یا بتسمہ لینا ہے اس سے بحذف العین ماخوذ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بات یہی ہے تو حرانی جو بیدین اور مشرک تھے ان کا نام صابیہ کیونکر ہو گیا؟ اس کے جواب میں موصوف کہتے ہیں "غالباً حرانیوں نے اپنے لیے یہ نام اس لیے اختیار کر لیا تھا کہ اس آڑ میں وہ مسلمانوں سے وہ مراعات حاصل کر سکیں جو قرآن یہود اور نصاریٰ کو اہل کتاب ہونے کی بنا پر عطا کرتا ہے۔ یہ منڈینس کون لوگ ہیں؟ کہاں آباد تھے؟ ان کا مذہب کیا تھا؟ اور کیا کوئی آسمانی کتاب بھی رکھتے تھے؟ مسٹر ڈبلو برانڈ (W. BRANDF) نے انسائیکلو پیڈیا آف

ریجن اینڈ اٹھکس ہیں ایک طویل اور فاضلانہ مقالہ لکھا ہے جس سے ان پر اور ان کے علاوہ اس سلسلہ کے دوسرے سوالات پر روشنی پڑتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: یہ لوگ بڑے فرقوں کی حیثیت سے یا ایک منفرد خاندانی گروپ کی حیثیت سے اب سے چالیس برس پہلے تک، اور مکن ہے اب بھی ہوں۔ فرات اور دجلہ کے نشیبی علاقوں میں اور ان دریاؤں کے کناروں پر آباد تھے جو مشرقی عراق عرب اور اس سے متصل ایرانی صوبہ خوزستان کی آبیاری کرتے تھے۔ مندرجہ بالا سوالات کے متعلق جو کچھ موصوف نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت یحییٰ کو پیغمبرانہ تھے اور اہل کتاب بھی تھے۔ ان کی متعدد کتابیں عیسائی مشنریوں کی کوشش سے آج کل یورپ کی لائبریریوں میں اچھی خاصی تعداد میں محفوظ ہیں ان میں اہم کتابیں دو ہیں ایک سدراربا (SIDRA RABBA) جس کے معنی عظیم کتاب کے ہیں اور دوسری گنزا (GENZA) پہلی کتاب ان کے عقیدہ میں وہ ہے جو حضرت یحییٰ پر نازل ہوئی تھی ان کتابوں میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ مذہبی مسائل و احکام عرفانی رموز و اسرار (MYTHOLOGICAL) اخلاقی مباحث اور تاریخی واقعات سے متعلق ہیں اور ادعیا اور اذکار ان میں خلط ملط ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت ہمارے قدیم مورخین نے لکھا ہے کہ یہ نماز قبلہ رو ہو کر پڑھتے تھے۔ روزہ بھی رکھتے تھے۔ ختمہ کی رسم بھی ان میں رائج تھی اور اکل و شرب اور نکاح کے متعلق ان کے ہاں جو احکام و مسائل تھے وہ اسلامی احکام مسائل سے ملتے جلتے تھے۔ قرآن میں حضرت یحییٰ کا صاحب کتاب ہونا مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ** (مریم)۔

ان امور کے پیش نظر خیال ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صابہ یہی لوگ ہیں لیکن اسی مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں جو اور تفصیلات لکھی ہیں ان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ چنانچہ (GENZA) جس کا ذکر اوپر آچکا ہے موصوف اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”اس کتاب کے ابواب و فصول جو غالباً سب سے زیادہ قدیم ہونے کی وجہ سے ہماری توجہ کے سب سے پہلے سختی میں وہ میں جن میں شرکانہ عقائد پائے جاتے ہیں یا

کم از کم وہ مشرکانہ نقطہ نظر پر مبنی ہیں ان میں سے بعض ابواب کا آغاز ان افکار و آرا سے ہوتا ہے جو دنیا کی تمام چیزوں یہاں تک کہ دیوتاؤں کی دنیا کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ اس گروپ میں وہ تمام سیکشن (حصے) داخل ہیں جن میں مابعد الطبعیاتی عقائد بیان کئے گئے ہیں اس سلسلہ میں ثمر اعظم جس سے دوسرے میٹا مورفیزم سے ہیں اور اسی طرح عظمت کا ماننا ہے اعظم جس سے دوسرے ماناؤں نے جنم لیا ان کا ذکر کیا گیا ہے اس سلسلے کی اہل عبارتوں میں معنی و مطالب کے اعتبار سے اس درجہ اختلاف ہے کہ ان سے کسی بنیادی خیال یا نقطہ نظر کا معلوم کرنا سخت دشوار ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان میں باہمی تضاد بھی ہے اس سے اندازہ ہے کہ یہ تصورات منڈنیس علماء نے دوسرے خارجی ذرائع سے اس وقت حاصل کیے تھے جب کہ ابھی خود ان کی کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں۔

اگرچہ اس کتاب میں توحید کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ اس میں ایک نوے کے بادشاہ کا ذکر ہے جس کا مقام سب سے بلند اور ارفع ہے جو تمام اجرام علویہ کا آقا اور تمام شکلوں اور صورتوں کا خالق۔ نیکی اور اچھائی کا سرچشمہ ہے اور اس کے سامنے جنت میں فرشتے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی چوتھی یا پانچویں صدی سے ہوئی ہے اس بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس فرقہ کا اصل مذہب توحید تھا۔ اب رہا یوم آخرت پر ایمان جو اہل کتاب ہونے کے لیے ضروری ہے تو یہی مقالہ نگار رکھتا ہے۔

”حشر کا عقیدہ تو ان لوگوں کی دینیات میں نہیں ہے ہی نہیں۔ اس بنا پر گنڈا نامی کتاب میں اس کا ایک مقام پر جو حوالہ ملتا ہے وہ غالباً یہودی یا عیسائی لٹریچر سے لے پروائی کے ساتھ نقل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے پورے ذخیرہ ادبیات میں پتہ نہیں چلتا کہ یہ لوگ سبت منانے لگے، ختنہ کی رسم ان میں رائج تھی،

یاعبادت میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے!

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد موصوف کہتے ہیں کہ ان لوگوں (منڈنیس) میں اور فرقہ مانویہ (مانی کو پیغمبر ماننے والا) میں بہت قریبی مماثلت ہے۔

علاوہ ازیں ایک انگریز خاتون سیزا سی۔ اینس۔ ڈراور (E. S. DRAWER) جس نے عراق اور ایران کے منڈنیس کے درمیان کئی برس گزارنے کے بعد ان پر ایک بڑی فاضلانہ اور قابل قدر کتاب لکھی تھی ان کی بھی رائے یہی ہے کہ ان لوگوں میں اور مانی کے پیروں میں بہت مشابہت ہے۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عراقی گروہ حرائیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ یہ سب لوگ دراصل فرقہ مانویہ کے ہی برگ و بار تھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں مانوی لوگ اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے اس فرقہ سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی ہے اور ساتھ ہی اپنی عقائد و افکار کے اظہار میں انھوں نے نو افلاطونی زبان استعمال کرنی شروع کی اور یہ سب کچھ اس غرض سے تھا کہ ان کے اصل مذہب کی کسی کو ہوا نہ لگے۔

ان لوگوں کے اخفائے مذہب کا اب تک یہ عالم ہے کہ موصوف سے پہلے سٹریٹون (PETEMANN) اور سووی (SIDOUFFI) ان میں کئی کئی مہینہ جا کر رہے مگر اس کے باوجود ان کی ایک مذہبی رسم تک نہیں دیکھ سکے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے یہ لوگ درحقیقت مشرک ہی تھے۔ مگر اسلام کے ابتدائی دور میں کچھ توحید کی سی باتیں کرنے لگے تھے۔ پھر ان کی کتاب میں تقیہ کی جو تعلیم ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کس درجہ کے توحید پرست اور صاحب کتاب تھے گنڈا میں لکھا ہے۔

”اگر تم لوگوں پر (عیسائیوں کی طرف سے) ظلم و ستم کیا جائے تو تم کہو کہ ”ہم تو تمہارے ہی ہیں“ مگر اپنے دلوں میں اس کا ہرگز اقرار نہ کرو اور نہ اپنے آقا ”نور کا شاہ

بلند کی آواز سے سرتابی کر دے کیونکہ دروغ گو مسیح کو پوشیدہ باتوں کی خبر نہیں ہوتی۔  
 جیسا کہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے مستشرقین ان لوگوں کو نموناً حضرت یحییٰ کا متبع مانتے ہیں۔ مگر  
 موصوفہ لکھتی ہیں یہ کہنا کہ یہ لوگ بتیسہ لیتے وقت یحییٰ (THE BAPTIST) کا نام لیتے ہیں  
 محض ایک افسانہ ہے۔ ان لوگوں کے اہل کتاب ہونے کا یہی آخری سہارا تھا وہ بھی ختم ہوا۔  
 بلاذری نے عراق کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے بنو تغلب کے عیسائیوں کو اہل  
 کتاب تسلیم نہیں کیا اور اس بنا پر ان سے جزیرہ لینا منظور نہیں کیا تبسجہ یہ ہوا کہ لوگ شہر چھوڑ  
 چھوڑ کر کثیر تعداد میں دوسرے علاقوں میں جا بسے۔ حضرت عمر کے اس فیصلہ کی توجیہ ایک فقہ  
 داؤد بن گردوس نے یہ کی ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے تبسج (BAPTISM) کو اپنے مذہب میں  
 داخل کر لیا ہے اس لیے ان کو اہل کتاب کی طرح ذمی قرار نہیں دیا گیا۔ داؤد بن گردوس  
 نے اس موقع پر ان لوگوں کے دین کے لیے مسمودیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی  
 (BAPTISM) ہیں۔

مستشرقین عام طور پر کہتے ہیں کہ مندنیس جو ان کے خیال میں درحقیقت صابئیہ ہی  
 ہیں عراق اور ایران کی سرحد پر پھیلے ہوئے تھے لیکن اگر یہ لوگ قرآن کے ایما کے مطابق  
 واقعی صابئیہ اور اہل کتاب تھے تو عراق و ایران کے فتوحات کے سلسلہ میں مورخین  
 کے ہاں کہیں تو اس حیثیت سے ان کا ذکر آنا چاہیے تھا ہماری رائے میں فتوح البلدان  
 میں جن کو مسمودیہ کہا گیا ہے وہ یہی مندنیس تھے اور چونکہ حضرت عمر نے ان کو اہل کتاب  
 تسلیم نہیں کیا اس لیے یہ ثابت ہوا کہ یہ لوگ قرآن کے صابئیہ نہیں تھے۔ امام ابوحنیفہ سے  
 البتہ ایک روایت ہے کہ صابئیہ اہل کتاب ہیں وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہیے۔

۱۵: ۱۵۱۵ OF LRA۱ AND LRA۱ P: ۱۵ THE MANDEANS OF

۳ ص ایضاً

۱۸۶ ص فتوح البلدان

۲۱۵: ۶.۰۰ V. 6. P: 215 LANE'S ARABIC ENGLISH LEXICON

بن ہمارا خیال ہے کہ یہ سنڈنیں جن کو مسلمانوں نے فتوحات کے زمانہ میں اہل کتاب تسلیم نہیں کیا اور اس کی وجہ سے ان کو پریشانی اٹھانی پڑی تھی انہی لوگوں نے بعد میں مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو صابی کہنا شروع کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مورخین اور فقہاء دونوں انہی لوگوں کو قرآن کا عصبہ سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف تھا۔

ابن ندیم نے ایک عیسائی مصنف ابو یوسف ایشیع القطیبی کی کتاب جو حرانیوں کے ماہب کے بارہ میں ہے اس کے حوالہ سے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ہمارے اس تیاس کی پرزور تائید ہوتی ہے۔ چونکہ واقعہ دلچسپ ہے اور اس سے موضوع بحث کے اور گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لیے ہم اسے بعینہ نقل کرتے ہیں۔

"ماموں رشید اپنے عہد خلافت کے آخری دنوں میں رزمیوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا تو نصر کے علاقوں سے اس کا گزر ہوا۔ یہاں اس سے بہت سے لوگ ملے جو اس کے لیے دعا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں حرانیوں کی ایک جماعت بھی تھی یہ لابی قبائیں پہنے ہوئے تھے اور ان کے بال بھی بڑے طول طویل تھے۔ ماموں کو ان کی یہ ہیئت عجیب سی معلوم ہوئی اور اس نے پوچھا کیا تم ذمی ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہم حرانی ہیں" ماموں نے کہا کیا تم نصاریٰ ہو؟ یہ بولے نہیں" ماموں نے پھر پوچھا کیا تم یہودی ہو؟ انھوں نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ ماموں نے کہا سوال کیا کیا تم مجوسی ہو؟ جب انھوں نے اس سے بھی انکار کیا تو ماموں نے کہا کیا تم کسی کتاب یا نبی کو مانتے ہو؟ اس سوال کا جواب بھی وہ ٹھکانے سے نہیں دے سکے تو ماموں نے کہا تم لوگ زندگی یعنی بت پرست ہو تم ذمیوں کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے" یہ بولے ہم تو جزیہ دیتے ہیں" ماموں نے جواب دیا جزیہ تو ان لوگوں سے لیا جاتا ہے جنھوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو اور وہ ان ادیان میں سے کسی دین کو مانتے ہوں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں کیا ہے۔ ان کے پاس کوئی کتاب بھی ہو اور مسلمانوں نے اس پر ان سے معاف کر لی ہو تم نہ ان لوگوں میں سے ہو اور نہ ان لوگوں میں اب تمہارے لیے دوپہ راستے

ہیں یا تو اسلام قبول کر لو یا جو ادیان معروفہ ہیں ان میں سے کسی دین کے پیرو بن جاؤ۔ ورنہ میں تم سب لوگوں کو قتل کر دوں گا۔ اس کے بعد مامون نے کہا کہ میں سفر میں جا رہا ہوں واپسی تک کی تم کو مہلت دیتا ہوں اس وقت تک کوئی فیصلہ کر لو۔ اس گفتگو کے بعد جب مامون روانہ ہو گیا تو ان لوگوں نے اپنا لباس بدل دیا بال منڈ وا دئے اور ان میں سے بہت سے لوگ عیسائی ہو گئے۔ ایک طبقہ مسلمان ہو گیا اور کچھ لوگ اپنے پرانے مذہب پر ہی قائم رہے۔ وہ سخت پریشان تھے کہ گلو خلاصی کی کیا تدبیر کریں۔ اسی اثنا میں ایک حو انی فقیہ ان کے پاس آیا اور بولا میری سمجھ میں تمہارے لیے ایک تدبیر آئی ہے اگر تم نے اسے کر لیا تو پوچھ جاؤ گے۔ ان لوگوں نے اس کو بہت کچھ مال متال دیا۔ اور پوچھا وہ کیا تدبیر ہے؟ فقیہ نے کہا وہ ہے یہ جب مامون واپس آئے تو تم لوگ کہنا کہ ہم تو صابیون ہیں۔ یہ اس دین کا نام ہے جس کا ذکر اللہ نے قرآن میں کیا ہے ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور یہ اپنے آپ کو صابیون کہنے لگے۔ ادھر یہ ہوا کہ مامون کا سفر میں ہی انتقال ہو گیا۔ مگر اس وقت سے یہ لوگ صابیہ کے نام سے مشہور ہو گئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عیسائی مذہب کو قبول کر لیا تھا وہ بھی اپنے پرانے مذہب کی طرف لوٹ آئے ورنہ حران یا اس کے اطراف و جوانب میں اس وقت تک کوئی قوم ایسی آباد نہیں تھی جسے صابیہ کہا جاتا ہو۔

اس واقعہ سے یہ تو بیشک ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ جنہوں نے مامون کے آخری عہد خلافت میں (سنہ ۲۲۸ھ/۶۸۳۰ء) حکومت سے ڈر کر صابیہ کا نام اختیار کر لیا تھا، اصلی صابیہ نہیں تھے۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ کا حل نہیں ہوتا۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ قرآن میں جب اس فرقہ کا نام اس اہتمام سے آیا ہے تو یقیناً اس فرقہ کو عہد رسالت میں نہیں بلکہ

س سے بھی پہلے سے اسی نام کے ساتھ معروف و مشہور ہونا چاہیے اور چونکہ ان آیات  
تعلقہ کے نزول کے بعد کسی صحابی سے یہ مردی نہیں ہے کہ انہوں نے حضور سے پوچھا ہو کہ  
صابیہ کون ہیں؟ اس لیے معلوم ہوا کہ یہ فرقہ اسی نام سے عہد رسالت میں موجود تھا اور سب  
لمان ان کو اچھی طرح جانتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین تو غور و فکر کے بعد صحیح یا غلط صابیہ کا مصداق کسی ایک فرقہ  
تعیین طور پر بتاتے بھی ہیں ہمارے عرب مورخین کے بیانات اس درجہ منتشر اور غیر مربوط  
ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچنا بڑا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم سعودی کے بیانات کو یکجا نقل  
تے ہیں جو قدیم مورخ ہے۔ اس پر دوسرے مورخین کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب بیانات  
باب التنبیہ والاشراف مکتبہ عصریہ بغداد ۱۹۳۸ء سے ماخوذ ہیں۔

۱) شاہان روم اپنے اپنے طبقہ کے مطابق حنفا تھے اور وہی صابیون ہیں یہ اس زمانہ کی  
ت ہے جبکہ انہوں نے عیسائیت کو قبول نہیں کیا تھا۔ قیصر فلپس (FILLIPPOS) نے  
عیسائیت کو قبول کیا اور صابیہ مذہب ترک کر دیا۔ جولینس (GULIANUS) پوشیدہ طور پر صابی  
چنانچہ جب یہ تخت نشین ہوا تو اس نے عیسائیت کو خیر باد کہا اور صرف یہی نہیں بلکہ جتنے بڑے  
تھے سب کو منہدم کر کے ان کی جگہ تائیل صابیہ از سر نو قائم کر دیے۔ علاوہ برین جو لوگ پھر  
ضعفیت کی طرف واپس نہیں آئے ان کو موت کی نرا دی۔ جو لوگ ضعیفیت کی طرف رجوع کر لیتے  
تھے ان کی علامت یہ تھی کہ آگ پر لوہان ڈالتے اور حنفا کے ہاتھ کے ذریعہ قربانی کے جانور  
جاتے تھے۔

۲) صابیون مصر ہی میں جن کے بچے کچھ اب حوانی ہیں۔ یہ لوگ ہرمس (HARMUS) اور  
تائیمون (LAGATHODAIMON) جو مشہور فراعنہ مصر ہیں ان کو پیغمبر مانتے تھے۔ مذکورہ بالا دونوں  
راعنہ میں ایک ہزار برس کی مدت کا فاصلہ ہے۔ سکان مصر جو دراصل قبطی ہیں وہ ان کو پیغمبر  
مانتے تھے مگر صاحب وحی نہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان دونوں کے نفوس پاک و صاف اور



اس عالم کے میل کچیل سے مبرا و منزہ تھے۔

(۳) گشتا سپ جس کی مدت حکومت ایک سو بیس برس ہے اس کو حکومت کرتے تیس برس ہوئے تھے کہ زردشت کا ظہور ہوا اور بادشاہ نے اس کا مذہب جو سیت قبول کر لیا۔ سب اہل مملکت بھی جو سسی ہو گئے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ لوگ حنفا یعنی صائبون تھے اور یہ وہی مذہب ہے جس کی تبلیغ بودا سپ نے ظہورث کو کی تھی اور یہ (صابیہ) سرپانی زبان کا لفظ ہے جس کو معرب کر لیا گیا ہے اور اس کی اہل حنیفوا۔ تھے۔

(۴) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صابین صابی بن متوشخ بن ادیس کی طرف منسوب ہیں۔ یہ صابی حنیفیت ادلی پر قائم تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لوگ صابی بن ماری سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ صابی حضرت ابراہیم کے عہد میں تھے۔

(۵) اور سمنیہ (شمنیہ) ! یہ لوگ چین کے صابہ ہیں اور یہ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ سب بودا سپ کے مذہب کے پیرو ہیں۔ یونان کے عوام بھی صابیہ ہیں اور یہ نماز میں رخ مشرق کی طرف کرتے ہیں، وہی صابیہ مصر جن کے بقایا حران کے صابیہ ہیں، یمن کی طرف رخ کرتے ہیں، وہی ان کا قبلہ ہے۔ یہ لوگ ان بہت سی چیزوں کو کھانا جائز نہیں جانتے جن کو یونان کے صابیہ کھاتے ہیں مثلاً خنزیر، چوزے، لہسن اور ویانہ۔ مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کے مندرجہ بالا بیانات کو دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ

صرف یہ ہی نہیں کہ وہ صابیہ کا مصداق کسی خاص ایک گروہ کو اور ان کے مسلک مذہب کو متعین طور پر بیان نہیں کر سکا، بلکہ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ صابیہ اور حنفا کے متعلق قرآن کا کیا بیان ہے مسعودی نے صابیت اور حنیفیت دونوں کو ایک دوسرے کا مراد

نہ ص ۱۸، ۱۱

نہ ص ۶۹

نہ ص ۸۰

نہ ص ۱۳۸

اور ہم معنی بتایا ہے اور پھر صابیحہ کی طرف مشرکانہ عقائد و اعمال منسوب کیے ہیں۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ حنیفیت بھی شرک کی ایک قسم تھی، حالانکہ قرآن میں ایک دو جگہ نہیں متعدد مقامات پر حنیفا اور حنیف کے الفاظ آئے ہیں اور ہر جگہ ان سے شرک کی نہی کی گئی ہے۔ مثال کے لیے آیات ذیل پر غور کیجئے :-

- (۱) حنیفاً لله غیر مشرکین بہ ط  
(الحج)
- صرف ایک خدا کے ہو کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا کر۔
- (۲) ما کان ابراہیم یهودیاً ولا نصرانیاً  
ولکن کان حنیفاً مسلماً وما کان  
من المشرکین (دال عمران)
- ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ ایک حنیف مسلمان تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔
- (۳) وان اقم وجهک للدين حنیفاً  
ولا تکلون من المشرکین (یونس)
- اور یہ کہ تو حنیف ہو کر دین پر ثابت قدم رہ اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو۔
- (۴) ان ابراہیم کان امه قانتاً لله حنیفاً  
ولم یک من المشرکین (النحل)
- بے شبہ ابراہیم ایک امام، اللہ کے فرزند اور حنیف تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔
- (۵) ثم اوحینا الیک ان اتبع  
ملة ابراہیم حنیفاً  
وما کان من المشرکین  
(النحل)
- ہم نے پھر تیری طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم جو حنیف تھے اور مشرکین میں سے نہیں اس کا اتباع کر۔

یہ اور ان کے علاوہ دوسری آیتوں سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ حنیف مشرک کی ضد ہے۔ پھر اگر صابیحہ میں شرک پایا جاتا ہے تو وہ حنیفیت کے ہم معنی یا اس کے مترادف کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مفسرین ہوں یا عرب مورخین اور یا مستشرقین۔ یہ سب قرآن کے فرقہ صابیحہ کا مصداق متعین کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہر ایک نے جو کچھ سنا یا پڑھایا ذاتی طور پر تحقیق کرنے کے بعد معلوم کیا وہ لکھ دیا ہے لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا

کہ ان کے بیان کا جامہ قرآن کے صابیہ کے قد و قامت پر بھی راست آسکتا ہے یا نہیں، اس لیے اس تمام ذخیرہ معلومات و تفصیلات پر غور کرنے کے بعد ہم جس نتیجہ پہنچے ہیں اب اسے بیان کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ لفظ صابی کی اصل کیا ہے؟ پہلے گزر چکا ہے کہ عام مفسرین اور مورخین کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صبا یصبا (ہموز للام) یا صبا یصبو ناقص (صادی) سے ماخوذ ہے جن کے معنی علی الترتیب ترک کرنا اور مائل ہونا ہیں۔ ایک شاذ قول یہ بھی نقل کیا گیا کہ حضرت نوح کے ایک بھائی کا نام صابی تھا۔ یہ لوگ اس نسبت سے صابی کہلاتے ہیں۔ محققین جدیدین سے ولہاسن (WELLHAUSEN) اور بعض اور لوگوں کی رائے ہے کہ یہ آرامی زبان کے ایک لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی میں غوطہ لگانا ہیں۔ صابیہ چونکہ پتھر لیتے تھے اس لیے ان کو صابیہ کہا جاتا تھا۔ لیکن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کا بیان ہے کہ "سریانی زبان کے لوگ لفظ ضیف کا اطلاق صابیہ پر کرتے تھے" اس کے علاوہ مسعودی کے جو بیانات اوپر گزرے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صابا اور صابیہ دونوں مترادف لفظوں کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا سب اقوال سے (ایک کو مستثنیٰ کر کے) یہ ظاہر ہے کہ ان سب حضرات کے نزدیک صابیہ نسلی نام نہیں ہے بلکہ مذہبی ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ نام نسلی ہے۔ یعنی شروع میں صابی یا اسی سے ملتی جلتی کسی لفظ کے نام کا کوئی شخص ہوگا، یہ لوگ اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں گے۔ خود ارباب لغت اور مورخین بھی اس سے خالی الذہن نہیں تھے، چنانچہ اوپر یہ قول گزرا ہی ہے کہ لوگ حضرت نوح کے چچا صابی کی نسبت سے صابیہ کہلاتے تھے۔ اس کے علاوہ چولسن کی کتاب کے حوالہ سے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ پرتھیا

FOREIGN VOCABULARY OF THE QURAN RIQIOL

۴۴ قدیم ادیشن ج ۲ ص ۲۰۹ لفظ ضیف

۵۵ الآثار الباقیۃ البیرونی ص ۲۰۶

سے صابی نام کا ایک شخص ایک کتاب لے کر آیا تھا جسے وہ الہامی کتاب کہتا تھا۔ یہ دونوں بیانات صحیح ہوں یا غلط، ان سے بہر حال یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ صابیہ نسلی نام بھی ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر تاریخ کے مختلف ادوار میں چونکہ ان لوگوں نے مذہبی اعتبار سے مختلف چولے بدلے اس لیے اس کی مناسبت سے لفظ وضع ہوتے رہے۔ ایک فرقہ نے پیٹنڈ مذہب (مغنتلہ) اختیار کیا تو صابی کے معنی پیٹنڈ ہو گئے اور ایک فرقہ نے مذہب حنیفی قبول کر لیا تو صبا تخف کے معنی میں مستعمل ہونے لگا اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدائشی گانوں ناصرہ کی طرف منسوب کر کے پیردان حضرت عیسیٰ کو نصاریٰ کہتے ہیں مگر پھر اسی سے فعل تنصّر بنا لیا گیا جس کے معنی مذہب تسلیمت کو قبول کرنا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا بالکل شروع میں مذہب کیا تھا؟ اور عہد بعہد اس میں کیا تغیر و تبدل پیدا ہوا؟ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ لوگ حضرت ادریس کے متبع تھے۔ اس سلسلہ میں امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہیے۔

(۱) حضرت ادریس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت آدم کے بعد پہلے پیغمبر ہیں۔ ان کا نام انوخ تھا اور یہ وہی ہیں جن کو بائبل میں (ENOCH) کہا گیا اور جنہیں حضرت نوح کا جد امجد بتایا گیا ہے۔

(۲) حضرت ادریس کے جو اوصاف و کمالات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک اہم وصف اور کمال یہ تھا کہ وہ علم النجوم کے بڑے ماہر اور فاضل تھے۔

(۳) حضرت ادریس کو ہرس بھی کہتے تھے۔

(۴) صابیہ کے ساتھ نجوم و کواکب کے احترام و پرستش کی روایات اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کا نام سنتے ہی ذہن اجرام علویہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

(۵) مسعودی کا بیان پہلے گزر چکا ہے کہ صابیہ ملوک روم میں سے ہرس کو پیغمبر مانتے تھے۔

لے صفحہ امام رافعب اصغیانی ص ۵۱۴

۴ مروج الذہب ج ۱ ص ۳۹ و الآثار الباقیہ ص ۲۰۱

(۶) ایک قول یہ گزر چکا ہے کہ حضرت نوح کے چچا کا نام صابی تھا اور عصابیہ ان کی نسبت سے صابیہ کہلاتے تھے۔

ان سب تنقیحات کو بیک وقت پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو یہ قیاس کرنا مستبعد نہیں رہتا کہ صابیہ دراصل حضرت ادریس کی متبع اور ان کی امت تھے۔ اس بنا پر یہ لوگ میرحد تھے، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہر مذہب کا قاعدہ ہے ایک عرصہ گزرنے کے بعد یہ اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور جا پڑے۔ حضرت ادریس کے واسطہ سے ان لوگوں میں علم النجوم کا بڑا چرچا تو تھا ہی۔ آخر یہ لوگ کواکب پرستی کرنے لگے اور ان کے ہیاکل و تماثیل کی پوجا کی شکل میں بت پرستی میں مبتلا ہو گئے چنانچہ مسعودی کا بیان ہے:

”جب ان لوگوں پر ایک زمانہ گذرا تو یہ بتوں کی پوجا اس خیال سے کرنے لگے کہ یہ ان کو اللہ سے قریب کریں گے اور یہ لوگ عبادت کو اکب سے مانوس ہو گئے۔ مندرجہ بالا عبارات کے بعد مسعودی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں کی کواکب پرستی اس وقت تک جاری رہی جبکہ ان میں بوداسف کا ظہور ہوا۔ لیکن ہماری رائے میں یہ غلط ہے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں بوداسف کے ہاں سرے سے خدا کے وجود کا کھٹے اور صاف لغظوں میں اعتراف موجود نہیں ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت انھیں لوگوں میں ہوئی اور یہ دعوت ابرہیمی کا اثر تھا کہ یہ لوگ پھر میرحد ہو گئے۔“

حضرت ابراہیم کی بعثت انھیں لوگوں میں ہوئی۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کلدان میں پیدا ہوئے تھے جس کو عام طور پر مورخین صابیہ کا وطن بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ

لہ مروج الذهب ج ۲ ص ۲۳۷

ڈاکٹر اسپرنگر کہتے ہیں حسانی اپنے مذہب میں جو قدیم کلدانیوں کا مذہب تھا ”عباسی خلافت کے قیام کے بعد بھی پختہ رہا۔“ انگریزی ترجمہ مروج الذهب جلد اول ص ۲۰۶ پھر بھی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے

”صابیہ اور کلدانی باکنائی ایک ہی تھے“ (ص ۲۱۸)

قرآن مجید سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ صابریہ نے کواکب و عقول کے ہیاکل و تماثل بنا رکھے تھے جنہیں وہ پوجتے تھے حضرت ابراہیم نے ان کو توحید کی دعوت دی تو فرمایا۔

ماہذہ التماثل التي انبتتم لها  
عاکفون ۛ

یہ مجھے جن سے تم لگے بیٹھے ہو کیا ہیں؟ یعنی ان کی کیا حقیقت ہے؟

اور اس کے بعد فرمایا۔

بل ربکم رب السموات والارض  
الذی فطرهن وانا علی ذلکم من الشہدین  
(الانبیاء)

بلکہ تمہارا رب تو آسمان اور زمین کا وہ رب ہے جس نے ان (ستاروں وغیرہ) کو پیدا کیا ہے اور میں اس بات کے لیے گواہ ہوں۔

یہ لوگ ستاروں کو عالم کائنات میں موثر بالذات مانتے اور ان کی پرستش کرتے تھے حضرت ابراہیم نے اس کا توڑ اس طرح کیا کہ ایک مرتبہ یہ لوگ ایک میدان میں جانے لگے تو انہوں نے حضرت ابراہیم سے کہا: آپ بھی چلئے۔ حضرت ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر کی تاکہ یہ لوگ سمجھیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے (ان کے عقیدہ کے مطابق) ستاروں کی گردش کے اثر سے ہو رہا ہے، اور پھر فرمایا "میں تو بیمار ہوں" قرآن نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

فنظر نظرة فی النجوم ۛ فقال انی  
سقیم ۛ

تب ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی اور کہا بے شبہ میں بیمار ہوں۔ (الصفہ)

اسی طرح سورہ الانعام میں حضرت ابراہیم کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے آسمان پر ستارہ دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، وہ غروب ہو گیا تو کہا: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا، پھر چاند اور سورج کے ساتھ بھی علی الترتیب یہی معاملہ پیش آیا تو آخر میں بول اٹھے:

لقوم انی برئ ما تشركون ۛ انی  
وجهت وجمہی للذی فطر السموات  
والارض حنیفا ۛ و ما انا من المشرکین ۛ

اے میری قوم! تم جن چیزوں کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بے جا ہوں، میں نے تو اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اس سے بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت ان لوگوں میں ہوئی تھی جو کواکب اور اجرام علویہ کی پرستش کرتے تھے۔

اب رہی یہ بات کہ صابیہ نے حضرت ابراہیم کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اور وہ پھر موحّد بن گئے تھے، اس کا ثبوت خود تاریخ سے ملتا ہے۔ ابن ندیم صابیہ کے بارہ میں جس کی معلومات ڈاکٹر اسپرنگر کے بقول سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہیں کیونکہ وہ بابل میں رہا ہے، لکھتا ہے:

قال احمد بن عبد اللہ بن سلام مولیٰ امیر المؤمنین ہارون (غالباً رشید) کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس کتاب کا ترجمہ کتاب الحنفاء وہم صابئون الا براہیمیۃ الذین امنوا بابراہیم علیہ السلام و حملوا عنہ الصحف الّتی انزلھا اللہ علیہ

احمد بن عبد اللہ بن سلام جو امیر المؤمنین ہارون (غالباً رشید) کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس کتاب کا ترجمہ کتاب الحنفاء سے کیا تھا اور یہ حنفاء وہ ابراہیمی صابیہ میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اللہ نے جو صحیفے ان پر نازل کیے تھے انہوں نے ان کو اپنی آسمانی کتابیں مان لیا تھا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ صابیہ کواکب پرستی اور شرک سے تائب ہو کر اللہ اور اس کے رسولوں پر اور عذاب و ثواب پر ایمان لے آئے تھے، نماز پڑھنے لگے تھے اور کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کا فرق کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ابن ندیم احمد بن الطیب کی ایک تحریر کے حوالہ سے بیان کرتا ہے جس کو اس نے کندی سے نقل کیا ہے:

یہ قوم (صابیہ) اس پر متفق ہے کہ عالم کے لیے ایک علت ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ واحد ہے، اس میں کثرت نہیں ہے۔ معلومات کی کوئی صفت اس کو لاحق نہیں ہوتی۔ اس نے اپنی مخلوقات میں سے اہل تمیز و عقل کو اس بات کا مکلف کیا ہے

۱۔ انگریزی ترجمہ مردج الذہب جلد اول ص ۲۱۸

۲۔ الفہرست ص ۳۲ یہ صحف ابراہیم جن کا ذکر قرآن میں بھی ہے تعداد میں کتنے تھے؟ ابن ندیم نے ان کی تعداد دس لکھی ہے ص ۳۲۔

کہ اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور ان کے لیے راستے واضح اور روشن کیے ہیں اور اس نے لوگوں پر اپنی محبت تمام کرنے اور ان کو راہ حق دکھانے کی غرض سے رسولوں کو بھیجا ہے اور ان کو اس کا حکم کیا ہے کہ وہ اس کی رضا کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور اس کے غضب سے ان کو ڈرائیں۔

پھر آگے چل کر انھیں کی نسبت مرقوم ہے:

”یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور ضعیفیت کی طرف بلاتے تھے۔ ان لوگوں کے ہاں نہ زبھی تین وقت کی کھٹی قبلہ بھی تھا روزے بھی تیس دن کے تھے جنابت سے غسل کرنے کا حکم بھی۔ اور محرمات طہام بھی تھے۔“

سید محمود شکر الالکوی، توحیران میں بھی ان لوگوں کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

وہولاء کافوا قوم ابراہیم الخلیل اور یہ لوگ حضرت ابراہیم خلیل کی قوم  
وہم اهل دعوتہ کافوا بجران فہی اور ان کے اہل دعوت تھے اور یہ  
دار الصابیۃ حیران میں تھے اور حیران صابئہ کا وطن ہے

حیران لوگوں کے اعمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان صابئہ میں متعدد گروہ ایسے ہیں جو ماہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں، نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کرتے ہیں، مکہ کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، مردار خون اور خنزیر کو حرام جانتے ہیں، ذوی الارحام سے نکاح کو مسلمانوں کی طرح حرام سمجھتے ہیں۔

یہی وہ صابئہ ہیں جن کی نسبت متعدد مؤرخین نے لکھا ہے کہ دمشق کی مسجد جامع انھوں نے بنائی تھی۔

۱۔ الفہرست صفحہ ۲۲۲

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۲۳

۳۔ بلوغ اللرب ج ۲ ص ۲۲۳

۴۔ ایضاً

۵۔ عجیب نامہ مقالہ جہوسی پدرسین ص ۳۸۸



بہر حال مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ صابہ اور حنفاد دونوں مترادف الفاظ ہیں اور قرآن جن کو صابہ کہتا ہے وہ حجاز میں کم از کم حنفا کے نام سے معروف تھے۔ لیکن معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حنفا کون تھے؟ اصل یہ ہے کہ جو صورت حال صابہ کے معاملہ میں پیش آئی ہے وہی حنفا کے سلسلہ میں پیش آئی، یعنی درحقیقت حنفا وہی لوگ تھے جو حضرت ابراہیم کے دین کے متبع اور اس کے پیرو تھے اور توحید پر ایمان رکھتے تھے۔ لیکن جب عرب میں عمر بن لُحی الخزاعی نے بت پرستی اور شرک کی ترویج کی تو بہت سے لوگ جو حنفا کہلاتے تھے، وہ بھی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ حنیفیت نام شرک کا ہو گیا۔ چنانچہ عہد جاہلیت میں بت پرستی بھی عام طور پر کہتے تھے کہ ہم دین ابراہیم پر ہیں۔

ایک روایت ہے کہ ابو عامر بن النعمان بن صفی نے جوگ لے لیا تھا اور حجم پر ٹاٹا لپیٹے رہتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ مدینہ آیا تو حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا آپ کیا لائے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "حنیفیت یعنی دین ابراہیم" اس شخص نے کہا: میں بھی تو اسی پر قائم ہوں۔ حضور نے فرمایا: "تو حنیفیت پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ تو نے اس میں ان چیزوں کو داخل کر لیا ہے جن کا حنیفیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے" اس روایت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ امتداد اور روزگار سے حنیفیت کی بھی اصل شکل و صورت مسخ ہو گئی تھی اور اصل و مسخ شدہ صورتوں میں ایسا التباس پیدا ہو گیا کہ لوگ عام طور پر دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار (لفظ حنیف) کی طرح پُرسن لکھتا ہے:

"حنیف کے معنی بس وہی ہو سکتے ہیں جو شامی لفظ "حنفہ" کے ہیں یعنی مشرک۔ پھر جو لوگ صراطِ مستقیم سے بہک گئے تھے ان کا معاملہ صرف بت پرستی تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ لوگ ایک طرف

۱۔ تاریخ العرب قبل الاسلام جلد ۶ ص ۲۹۰

۲۔ تفسیر روح المعانی جلد ۹ ص ۱۱۱

۳۔ عجب نامہ ص ۳۹۰

یہودیت اور عیسائیت سے متاثر ہوئے اور دوسری جانب نوافلاطونیت نے ان پر اپنا رنگ جایا تو پھر وہی عقول عشرہ نفوس مجردہ اور نجوم و کواکب کی باتیں کرنے لگے۔ اس طرح حنیفیت اپنی مسخ شدہ صورت میں بھی کسی ایک خاص نہج پر قائم نہیں رہی اور مختلف عقائد و افکار کا مجموعہ مرکب بن گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ حنیفیت کے معنی و مفہوم بھی بدلتے رہے۔ جس نے حنیفیت کو جس رنگ میں دیکھا اس کے وہی معنی بیان کر دئے

دنیا میں خیر اور شر ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر غلبہ کبھی اس کا ہوتا ہے اور کبھی اُس کا۔ جس طرح ہدایت کے بعد گمراہی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح گمراہی جب عام اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے تو کچھ سعادت مند رعوں کو حق و ہدایت کی جستجو ہوتی ہے۔ ان میں جو خوش نصیب ہوتے ہیں وہ گوہر مقصود پالیتے ہیں اور دوسرے جستجو ہی کرتے کرتے حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں چنانچہ جب حنیفیت کی اصل شکل مفقود ہو گئی تو بعثت محمدی کے قریبی عہد میں عرب میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو بت پرستی اور شرکانہ اعمال سے سخت بیزار اور متنفر ہو کر اصل حنیفیت یعنی دین ابراہیمی کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ طبقہ حنفا تھا۔ جو شخص بت پرستی سے جو قریش کا عام مذہب تھی، بیزار ہو کر توحید کا قائل ہوتا اور دین ابراہیمی کے گمشدہ راستہ پر چلنے کی کوشش کرنے لگتا تھا، قریش اسی کے متعلق "صبا فلان" کے الفاظ کہتے تھے اور چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین ابراہیمی کے داعی اور مجدد تھے، اس بنا پر قریش حضیر کی نسبت بھی یہ جملہ بولتے تھے جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔

اس طبقہ میں ایک ممتاز شخصیت زید بن عمرو بن نفیل کی ہے جو حضرت عمر فاروق کے چچا زاد بھائی تھے۔ سیر و اسمائے رجال کی کتابوں میں ان کے حالات درج ہیں۔ ان سے اندازہ ہو گا کہ یہ طبقہ حنفا اپنے عقائد و افکار کے اعتبار سے عام عربوں سے کس درجہ ممتاز

۱۔ اسی لیے مسعودی نے حنیفیت کی دو قسمیں کی ہیں ایک حنیفیت اولیٰ جو دعوت ابراہیمی قبیل کمنے کے بعد صابریہ کا مذہب تھا اور دوسری حنیفیت ثانیہ جو بت پرستی اور شرک کے ہم معنی تھی

(التبئہ والاشراف ص ۱۱۸)

تھا۔ یہ نہ مشرک تھا، نہ یہودی، نہ نصرانی اور نہ مجوسی، توحید کا قائل تھا اور شرک سے بیزار اور اصل دین ابراہیمی کا جو یا چنانچہ زید بن عمرو بن نفیل جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تھی مگر آپ کی بعثت سے پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا، کسی شخص نے ان کے متعلق حضور سے سوال کیا تو فرمایا "زید جاہلیت میں عبادت کرتا تھا۔ اسے ابراہیم الخلیل علیہ السلام کے دین کی طلب تھی۔ وہ توحید کا قائل تھا اور کہا کرتا تھا: میرا معبود ابراہیم کا معبود اور میرا دین ابراہیم کا دین ہے۔ وہ قریش کے ذبیحہ پر اعتراض کرتا اور کہتا تھا: اللہ نے بکری کو پیدا کیا، آسمان سے اس کے لیے پانی برسایا اور زمین سے چارہ اگایا اور پھر بھی تم ہو کہ غیر اللہ کا نام لے کر اسے ذبح کرتے ہو۔ جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوتے تھے زید اسے نہیں کھاتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کو زندہ درگور دفن کرنے کے سخت مخالف تھے۔ زید کو دین ابراہیمی کی طلب ہوئی تو اس جستجو میں وہ عراق و شام تک پہنچے۔ مگر کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ آخر حیرہ کے ایک شیخ نے بتایا کہ تم خود اہل بیت اللہ میں سے ہو تم جس کی (دین حنیف) تلاش میں ہو اسے لے کر ایک نبی تمہارے ہی درمیان مبعوث ہونے والا ہے، وہ پیدا ہو چکا ہے اور اس کی نبوت کے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔

زید کو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا زمانہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، لیکن چونکہ وہ موصد تھے اور دین ابراہیمی کی طلب صادق رکھتے تھے اس لیے حضور نے ارشاد فرمایا: "زید قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ وہ خود ایک امت ہوگا۔" بہر حال جس عہد کا ہم ذکر کر چکے ہیں اس میں جب حنیفیت کی اصل شکل و صورت مسخ ہو کر عقائد و افکار باطلہ کا معجون مرکب بن گئی تو چونکہ دین حنیف اصلاً حضرت ابراہیم کی ہی طرف منسوب تھا اس لیے حنیفیت کی مسخ شدہ صورت کے جس پہلو کا جو گروہ حامل تھا اس نے حضرت ابراہیم کی طرف بھی اس کا انتساب شروع کر دیا۔ چنانچہ جو لوگ مشرک تھے وہ شرک کو، جو یہودی اور نصرانی تھے انہوں نے یہودیت اور نصرانیت کو اور جو نوافل طونیت (NEO PLATONISM) سے

۱۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ ابن الاثیر ج ۲ ص ۲۳۶-۲۳۷

۲۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۳۷

متاثر تھے وہ نوافلاطونی عقائد و افکار کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بڑی شدت، تکرار و تاکید کے ساتھ ان تمام خیالات و افکار باطلہ کی تردید کر کے ان سب چیزوں سے حضرت ابراہیم کی برات کی گئی ہے متعدد آیات اسی مضمون کی ادھر گزر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں۔ ان کا سیاق و سباق ان کا نظم و نسق کلام یہ سب اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ ان کا مقصد درحقیقت ان خیالات کی پرزور تردید کرنا ہے جو امتداد روزگار اور مختلف داخلی و خارجی اسباب کے ماتحت دین ضیف اور خود حضرت ابراہیم کے متعلق لوگوں میں پیدا ہو گئے تھے اور جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ان آیات کے علاوہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب ضرورت ہوئی ان خیالات کی تردید فرمائی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن میں صابہ سے مراد یہی خنفا ہیں تو پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ ان لوگوں کو زیر بحث آیات میں صابہ کے نام سے پکارا گیا ہے اور ان کو خنفا نہیں کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عہد نبوت سے ذرا قبل یہ خنفا اچھی خاصی تعداد میں تھے لیکن ان کی حیثیت جو کچھ بھی تھی انفرادی اور شخصی تھی اور انھوں نے کسی مذہبی فرقہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی اگرچہ مشرقین میں ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے یہی ہے کہ خنفا ایک شریعت ثابتہ پر قائم تھے اور اسی لیے ایک مستقل فرقہ کی حیثیت رکھتے تھے لیکن عہد حاضر کے نامور محقق ڈاکٹر جواد علی نے اس خیال کی پرزور تردید کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خنفا ایک رائے اور ایک دین پر تھے اور اس بنا پر وہ ایک ایسا ہی فرقہ تھے جیسا کہ یہودی اور نصاریٰ ہیں، بلکہ دراصل یہ خنفا متفرق قبیلوں کے چند افراد تھے جو کسی خاص ایک رشتہ سے وابستہ نہیں تھے۔ البتہ ان سب میں یہ ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ یہ بت پرستی سے نفور اور اس کے منکر تھے اور اصلاح کے داعی تھے۔ قرآن مجید کی جن آیات میں خنفا کا ذکر ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔“

پس جب خنفا مستقل فرقہ کی کوئی شکل نہیں رکھتے تھے تو جہاں قرآن مجید یہود، نصاریٰ اور مجوسی ایسے مستقل مذہبی فرقوں کا ذکر کر رہا تھا، وہاں بلاغت کلام کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو اس

نام سے پکارا جائے جو ان کا دیرینہ فرقہ دارانہ نام (یعنی صابئہ) تھا، اور یہ بلاشبہ جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے حضرت ابراہیم کے اہل دین ضعیف کے قائل ہونے کے باعث موحّد اور اہل کتاب کے آخر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ جب دعوتِ محمدی کا غلغلہ بلند ہوا تو جس طرح یہود اور نصاریٰ میں جو خوش نصیب اور سعادت مند تھے، انھوں نے اس پیغام کو لبیک کہا اور دل و جان سے قبول کیا مگر جن کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی وہ اپنی ضد پر جمے رہے اور گمراہی سے نجات نہیں پاسکے۔ اسی طرح خنفا کے اس گروہ میں بھی دین و دنیا کی فلاح جن کے مفقود میں تھی انھوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا اور جس گوہرِ مفقود کی جستجو میں یہ سرگرداں تھے اسے پایا۔ لیکن امیہ بن ابی الصلت جس کی نسبت اس کے اشعار دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

امن لسانہ و کفر قلبہ  
اس کی زبان ایمان لائی ہے اور اس کے قلب  
نے کفر کیا ہے۔

یہ اور اس جیسے اور بعض خنفا جن کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی وہ اس سے محروم ہی ہے اس بنا پر قرآن کی صابئہ والی آیات میں ان لوگوں کو یہود و نصاریٰ کے دوش بدوش ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں میں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لے آئیں گے (یعنی دعوتِ محمدی قبول کر لیں گے) اور اعمالِ صالحہ کریں گے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہوگا۔ ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

# الأميون

قرآن مجید میں الامیوں کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "امی" کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:-

«فأمنوا بالله ورسوله النبي الامي  
الذي يؤمن بالله وكلماته واتبعوه لعلكم  
تهدون» (الاعراف)

تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر  
جو امی نبی ہیں اور جو اللہ اور اس کی باتوں  
پر ایمان لاتے ہیں اور اس پیغمبر کی پیروی کرو  
تا کہ تم سیدھے راستے پر چلو۔

ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ امی اسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ اور چونکہ یہ لوگ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی نوشت و خواند سے نابلد تھے اس لیے قرآن میں ان کو "امیوں" کہا گیا ہے اور خود حضور بھی ایسے ہی تھے اس لیے آپ کی صفت امی بیان کی گئی ہے۔ مفسرین نے عام طور پر اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:-

«الاميين» الذين لا يكتبون ولا  
يقرونها  
امی وہ لوگ ہیں جو نہ لکھنا جانتے  
ہوں اور نہ پڑھنا

پھر اس کی لغوی توجیہ میں فرماتے ہیں کہ لکھنے کا فن مردوں میں پایا جاتا تھا، عورتوں میں نہیں۔ اس بنا پر جو لوگ لکھنا نہیں جانتے تھے ان کو ماں کی طرف منسوب کر کے امی

تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۷

کہا گیا ہے: طبری نے امیین کی یہ تشریح سورہ البقرہ کی حسب ذیل آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں کی ہے۔

ومنہم امیون لا یعلمون الکتاب

اور ان میں کچھ امی ہیں جو کتاب کو نہیں

الامانی وان ہم الا یظنون

جاننے سوائے من مانی باتوں کے، اور یہ صرف ظن اور تخمین سے کام لیتے ہیں

(آیت ۷۷)

مگر سورہ آل عمران میں بھی ایک آیت ہے جس میں یہ لفظ آیا ہے اور وہ یہ ہے۔

اور وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے اور

«وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین

جو امی ہیں، اے محمد، آپ ان سے کہہ دیجئے

ااسلمتم فان اسلموا فقد اهدوا وادان

کہ کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ پس اگر وہ اسلام

تولوا فانما علیک البلاغ والله بصیر

لے آئے ہیں تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے اور اگر

بالعباد

انہوں نے سرتابی کی تو بس آپ پر تو پہنچانا

(آیت ۱۷۷)

ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

طبری نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

امیین سے مراد مشرکین عرب میں جن کے

«الامیین الذین لا کتاب لہم من

پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔

مشرک العربی»

یہی لفظ سورہ الحجۃ کی ایک آیت میں بھی آیا ہے:

وہ خدا وہ ہے جس نے امیین میں انہیں میں

«هو الذی بعث فی الامیین رسولا

سے ایک رسول کو ظاہر کیا جو ان پر اللہ کی

منہم یتلوا علیہم آیتہ ویزکیہم وعلیہم

آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے

الکتاب والحکمۃ وان كانوا من قبل نفی

اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

ضلال مبین»

اگرچہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے

(آیت ۱۷۷)

اس آیت کی تفسیر میں تقریباً سب مفسرین لکھتے ہیں کہ اس میں امیین سے مراد عرب

ہیں۔ چنانچہ عہد حاضر کے مقبول مفسرین، سید رشید رضا صاحب "تفسیر المنار" اور شیخ محمد

جمال الدین القاسمی صاحب "تفسیر القاسمی" نے یہی لکھا ہے۔

اب مذکورہ بالائینوں آیات جن میں امیون کا لفظ آیا ہے ان کو بیک وقت سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین نے امیون کے کوئی ایک معین معنی مراد نہیں لیے ہیں بلکہ یہ لفظ تین جگہ آیا ہے تو ہر جگہ معنی بھی ایک دوسرے سے مختلف مراد ہیں اور اس بنا پر خیال انتہات پیدا ہوتی ہیں:

(۱) اگر امیون سے مراد وہ لوگ ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو یہ لفظ مشرکین اور اہل عرب کے ناخواندہ لوگوں پر بھی صادق آسکتا ہے۔ پھر سورہ آل عمران کی آیت کی تفسیر میں امیون سے فقط مشرکین کو مراد لینا کیونکر صحیح ہوگا؟

(۲) اگر اس سے مراد مشرکین ہیں تو اب اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں، ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امی کہا گیا ہے، پھر اس کے معنی کیا ہوں گے اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سورہ البقرہ کی آیت میں اہل کتاب میں سے بھی بعض لوگوں کو امیون فرمایا گیا ہے اس کی توجیہ کیا ہوگی؟

(۳) سورہ المائدہ کی آیت کی تفسیر میں اگر امیون سے مراد عرب ہیں تو پھر سورہ البقرہ اور سورہ آل عمران کی آیتوں میں علی الترتیب امیون سے ناخواندہ اور مشرک مراد لینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ لوگ جس طرح عرب میں پائے جاتے ہیں غیر عرب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ان سب سوالات کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ گو کے لوگوں کی صفت غالبہ نوشت خواند سے عاری ہونا تھی اس لیے الامیون ان کا اسم صفتی ہو گیا اور چونکہ یہ لوگ عرب بھی تھے اور مشرک بھی اس لیے اس لفظ کا اطلاق ان دونوں پر بھی مجازاً ہونے لگا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا نوشت و خواند سے عاری ہونا واقعی دادی قری کے اصحاب کی ایسی خصوصیت تھی جس میں وہ دوسرے لوگوں سے اس درجہ ممتاز تھے کہ وہ ان کی صفت غالبہ بن سکتی تھی؟ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔

سیر و تاریخ کی کتابوں میں ایسے حضرات کے نام جا بجا ملتے ہیں جو عہد جاہلیت میں



نوشت و خواند سے اچھی طرح آشنا تھے۔ سہیلی نے ایسے صحابہ کے ناموں کی فہرست دی ہے جو بارگاہ نبوی میں تحریر و کتابت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ان میں بعض حضرات جو اس فن میں خاص درک و کمال رکھتے تھے، الکاتب "ان کے نام کا جز ہی ہو گیا تھا۔ حضرت حنظلہ بن الربیع کا شمار ان ہی لوگوں میں تھا۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو ایک شاعر نے مرثیہ میں کہا:

ان سواد العین اودی بہ حزن علی حنظلۃ الکاتب

دو بار نبوی میں جو صحابہ تحریر و انشا کی خدمت انجام دیتے تھے ان کی تعداد کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عمر بن شیبہ نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ ابو عبد اللہ محمد بن عبدوس الجیشیاری (م ۳۳۱ھ) نے بھی ان صحابہ کے نام لکھے ہیں اور اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف شعبے قائم کر رکھے تھے اور ہر شعبہ کا تحریری کام خاص خاص صحابہ کے سپرد تھا۔ ان شعبوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کتابت وحی: اس پر حضرت علی اور حضرت عثمان مقرر تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ابی بن کعب اور زید بن ثابت یہ کام کرتے تھے۔

(۲) پیشکاری: خالد بن سعید اور معاویہ بن ابی سفیان۔

(۳) معاملات عامہ: عقیقہ بن شعبہ اور حسن بن نمر۔

(۴) عبد اللہ بن ارقم اور عمار بن عقبہ اس پر مامور تھے کہ قبائل اور انصار کے جو اندرونی معاملات تھے ان کے متعلق تحریری کام کرتے تھے۔

(۵) زید بن ثابت: کتابت وحی کے ساتھ بادشاہوں سے خط و کتابت کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

(۶) دفتر منام: عقیب بن ابی فاطمہ۔

(۷) حنظلہ بن الربیع کے لیے کوئی شعبہ مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ جب کسی شعبہ کا کوئی کاتب غیر حاضر

ہوتا تھا تو یہ اس کی قائم مقامی کرتے تھے اور حضور کی جہر بھی انھیں کے پاس رہتی تھی۔  
ان شعبوں کا ذکر سعودی نے بھی کیا ہے اور ان پر حسب ذیل شعبوں کا اضافہ کیا ہے۔

( ۱ ) اموال صدقات: زبیر بن عوام اور جہیم بن الصلت۔

( ۲ ) نخلتان کا حساب و کتاب: خدیفہ بن ایمان۔

سعودی دربار نبوی کے کا تبین کا شعبہ وار تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:  
ہم نے یہاں صرف ان حضرات کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت  
میں مستقل ایک مدت تک کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے تھے اور اس بات کا قطعی ثبوت  
بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے عارضی طور پر یہ کام کیا تھا، ہم نے ان کا تذکرہ نہیں  
کیا ہے۔

پھر ان حضرات میں ایسے بھی لوگ تھے جو عربی زبان کے علاوہ فارسی، رومی، قبطی اور  
جہشی زبانوں میں بھی کتابت کر سکتے تھے۔ زید بن ثابت نے یہ سب زبانیں مدینہ میں خود اہل زبان  
سے سیکھی تھیں اور بارگاہ نبوی میں ترجمان کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص  
بھی عبرانی اور سریانی زبانوں میں کتابت کرتے تھے۔ عورتیں تک اس فن سے واقف تھیں۔ اس  
سلسلہ میں شفاعت عبد اللہ مشہور تھی۔ ان سب سے قطع نظر خود قرآن مجید سے بھی اس کا ثبوت  
ملتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت عرب میں کتابت مرد و عورت تھی۔ ارشاد ہے۔

”یا ایہا الذین آمنوا اذا تداینتم  
اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی مقررہ مدت  
بدین الی اجل مسمیٰ فاکتبوا“ (البقرہ)  
کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔

۱۔ کتاب الوزو، ۱ و ۲، کتاب ص ۹

۲۔ کتاب التبیہ والاشراف ص ۲۸۴

۳۔ سعودی ص ۲۸۳ جلد ۴ ص ۲

۴۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۲

۵۔ الروض الالنف ج ۲ ص ۲۳۰

ایک اور آیت ہے۔

پس ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو  
کتاب اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں  
”یہ اللہ کی طرف سے ہے“

”فویل للذین یکتبون الکتب بایديهم  
ثم یقولون هذا من عند اللہ“ (البقرہ)

قرآن میں کتاب کا لفظ مفرد اور جمع دو سوا کسٹھ مرتبہ آیا ہے اور کتابت سے متعلق جو  
چیزیں ہیں مثلاً کاغذ، روشنائی، قلم، دوات، پھر خود کتاب کے لیے عربی زبان میں جو مختلف الفاظ  
ہیں مثلاً صحیفہ، زبور وغیرہ ان کا قرآن میں جایگزین کرنا ہے۔ یہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ  
عرب فن کتابت سے نا آشنا نہیں تھے۔ بقول ابن فارس کے جہاں تک نوشت و خواند کے جاننے  
کا تعلق ہے۔ عرب اسلام سے پہلے ایسے ہی تھے جیسے آج کل ہیں۔ یعنی پہلے بھی ہر شخص اس سے واقف  
نہیں تھا اور آج بھی ہر ایک اس سے آشنا نہیں ہے۔

ہمارے زمانہ کے نامور محقق ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں:

”ہم اس بات کا خیال بھی نہیں کر سکتے کہ اہل جاہلیت کے سب لوگ امی تھے  
اور ان میں کوئی قاری اور کاتب نہیں تھا۔ ہمیں معلوم ہے اکثر لوگ لکھنا پڑھنا  
جانتے تھے کیونکہ ان کے نوشتہ آثار جو دستیاب ہوئے ہیں اس کا بین ثبوت ہے  
علاوہ بریں مورخین عام طور پر کہتے ہیں کہ قریش میں ارباب نوشت و خواند کا قحط  
نہیں تھا“

حال میں مصر کے ایک فاضل ڈاکٹر ناصر الدین الاسد نے ”مصادر الشعر الجاہلی“ کے نام سے  
ایک بلند پایہ محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں (از ص ۲۶ تا ۱۰۳) بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے  
کہ عرب قبل الاسلام میں قرأت و کتابت کا فن کس قدر مروج تھا؟ یہ کن کن زبانوں کی کتابت

۱۔ المعجم المفہر من القرآن از ص ۵۹۲ تا ص ۵۹۵

۲۔ الصحیح ص ۹

۳۔ تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۶ ص ۹۹

جانتے تھے؟ ان کی کتابت کے موضوعات کیا تھے؟ کتابت کا ساز و سامان کیا تھا؟ اس فن میں نامور اور مشہور کون کون لوگ تھے؟ اور کتابت کی تعلیم کے مدرسے کہاں کہاں قائم تھے؟ موصوف نے جو کچھ لکھا ہے مدلل اور مفصل لکھا ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ عرب قبل الاسلام کو من حیث المجموع یا خاص مکہ اور اس کے اطراف جو انب کے عربوں کو "امیون" کا لقب ہرگز اس معنی میں نہیں دیا گیا کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔

یہ گفتگو تو عام عربوں سے متعلق تھی۔ اب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے تو اگرچہ مشہور یہی ہے کہ آپ نوشت و خواند سے نا آشنا تھے لیکن علما کا ایک طبقہ اس خیال سے متفق نہیں ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کے نامور عالم اور محقق شیخ محمود محمد شاہ لکھتے ہیں:

وقد یما قام بعض اساتذتنا یدعی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یعرف الکتابۃ ولکنہ لا یحسنہا۔  
اور پہلے سے ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا جانتے تھے اگرچہ اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے بھی اس رائے کو متعدد علماء مثلاً ابو الولید الباجی، ابو ذی الہروی اور ابو الفتح النیابوری کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ افریقہ کے کچھ اور علما کا بھی خیال یہ تھا۔

لہٰذا اس معاملہ میں غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ زمانہ قبل الاسلام کو جو عہد جاہلیت کہا جاتا ہے تو لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ جہل علم کی ضد ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جہل علم کی نہیں بلکہ علم کی ضد ہے جس کے معنی برباری، سمجھ بوجھ اور متانت و سنجیدگی ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

الا لا یجہلن احد علینا فنجہل فوق جہل الجاہلینا

(ترجمہ۔ خبردار! ہم سے کوئی اجدہن کی باتیں نہ کرے۔ ورنہ پھر ہم اجدہ لوگوں سے بڑھ کر اجدہ بنیں گے)

تفسیر ابن جریر طبری (حاشیہ) ج ۲ ص ۲۸۵

فتح الباری ج ۷ ص ۴۰۵

اس کے علاوہ سہیلی نے بھی ایسے حضرات کی نشاندہی کی ہے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علی صلوات اللہ علیہ لکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جب لکھا "بذا قاضی علیہ محمد رسول اللہ" تو اس پر قریش کے نائندوں نے اعتراض کیا اور کہا اگر ہم آپ کو رسول اللہ مانتے ہی ہوتے تو آپ کو روکتے کیوں؟ حضور نے فرمایا: "میں تو خیر رسول اللہ ہوں ہی" اور حضرت علی کو حکم دیا کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دیں۔ حضرت علی نے جب اس حکم کی تعمیل سے معذرت خواہی کی، تو اب وہ نوشتہ حضور نے خود لے لیا اور اس پر تخریر فرمایا "هذا ما قاضی محمد بن عبد اللہ الی الآخرۃ" اصل الفاظ جو اس موقع پر ہیں وہ یہ ہیں:

فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

الکتب فکتب۔ وہ نوشتہ خود لے لیا اور تخریر فرمایا۔

بخاری میں یہ روایت ایک ہی اسناد سے دو جگہ مذکور ہے۔ اولاً کتاب الصلح میں

اور ثانیاً کتاب المغازی کے ماتحت باب عمرة القضا میں۔ دونوں جگہ الفاظ ایک ہی ہیں فرق

صرف اتنا ہے کہ ثانی الذکر روایت میں "فکتب" کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں "ولیس یجس الکتاب"

ابن سعد نے بھی واقعہ حدیبیہ کے ذکر کے سلسلہ میں اس موقع پر جو الفاظ لکھے ہیں وہ

یہ ہیں:

"لما کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الکتاب الذی بینہ و بین اهل مکة"

اس کے بعد عہد نامہ لکھا گیا تو:

"کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم فی اسفل الکتاب ولنا علیکم مثل الذی

لکم علینا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تخریر

کے نیچے لکھا اور تم پر ہمارے حقوق وہی ہوں

گے جو ہم پر تمہارے ہیں۔

اس کے علاوہ طبری نے جب یہ واقعہ نقل کیا ہے تو اس میں بھی فعل دکتب کی اسناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے۔ غرض کہ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور کتابت جانتے تھے۔ مگر جو حضرات اس کے قائل نہیں ہیں وہ اس میں عجیب طرح کی تاویلات کرتے ہیں، از روہ یہ ہیں،

(۱) روایت میں فعل دکتب کے معنی ہیں امر، از مطلب یہ ہے کہ حضور نے لکھنے کا حکم دیا، کیونکہ کاتب تو حضرت علی ہی تھے۔

(۲) "ولیس یحسن یکتب" کے معنی یہ نہیں کہ آپ کتابت اچھی طرح نہیں جانتے تھے جس سے حضور کے لیے نفس کتابت ثابت ہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ کتابت بالکل جانتے ہی نہیں تھے اور "ولیس" "یحسن" کے الفاظ محض برکت ادب کہے گئے ہیں۔

یہ دونوں تاویلیں شیخ محمود محمد شاہ نے پوری قوت سے بیان کی ہیں۔ لیکن ایک سرسری نظر سے جائزہ لیا جائے تو ان کی بے حقیقتی ظاہر ہو جاتی ہے چنانچہ ان کے جو ابات علی الترتیب یہ ہیں،

(۱) صحیح بخاری کی روایت میں یہ الفاظ صاف طور پر موجود ہیں کہ جب حضرت علی نے رسول اللہ کے الفاظ محو کرنے سے معذرت کی تو اخذ رسول اللہ المکتب مکتب، تو ظاہر ہے کہ یہاں کتب کی اسناد حضور کی طرف اسناد حقیقی ہی ہوگی نہ کہ مجازی کیونکہ کتب اور اخذ، دونوں کا فاعل حضور ہیں اور جب اخذ کی اسناد حقیقی ہے تو کتب کی اسناد بھی ایسی ہوگی۔ ورنہ حضرت علی کی معذرت خواہی پر اخذ کے کیا معنی ہیں؟

(۲) "ولیس یحسن یکتب" کے اگر معنی یہ ہیں کہ "ولیس یکتب" آپ لکھ ہی نہیں سکتے تھے تو اس سے لازم آتا ہے راوی کا حضور کی طرف بیک وقت دو نقیضوں یعنی کتابت و عدم کتابت کا منسوب کرنا۔ اور ظاہر ہے اس سے کلام مہمل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہی

ملۃ تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۰

تہ حاشیہ تفسیر ابن جوزی طبری ج ۲ ص ۲۵۸

روایت بخاری میں کتاب الصلح کے ماتحت ہے اور اس کے علاوہ طبری اور ابن سعد وغیرہ کے ہاں ہے تو اس میں صرف "کتب" کا لفظ ہے اور "ولیس یحسن یکتب" سے ہی نہیں۔  
 شیخ محمود محمد شاہ بھی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر کاتب تو حضرت علی تھے۔ پھر حضور کتابت کیوں کرتے؟ جواب یہ ہے کہ جی ہاں! کاتب حضرت علی ہی تھے مگر درمیان میں یہ واقعہ پیش آیا تو حضور نے خود قلم لے لیا اور پہلے "رسول اللہ" کے الفاظ تحریر سے جو کئے اور پھر آگے کی عبارت تحریر فرمائی چنانچہ ابن سعد اور طبری کے ہاں حضرت علی کا نام اس موقع پر بحیثیت کاتب سرے سے مذکور ہی نہیں ہے۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ شیخ نے جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل وہی ہے جسے حافظ ابن حجر اس مسئلہ میں مختلف مکاتب فکر کا تذکرہ کرنے کے بعد مسلک جمہور کی تائید میں لکھ چکے ہیں۔  
 اصل بات یہ ہے کہ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے وہ اپنے منطوق اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف اور واضح ہے لیکن اس کے باوجود ان توجیہات و تاویلات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قرآن مجید کی سورہ الاعراف کی دو آیتوں (۱۵۷-۱۵۸) میں مسلسل حضور کی عنف امی بیان کی گئی ہے اور امی کے معنی عام طور پر مفسرین، محدثین اور علماء کے ہاں یہ ہیں کہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ اور اس چیز کو چونکہ آپ کے لیے بطور ایک معجزہ کے پیش کیا جاتا ہے چنانچہ شیخ سعدی کا نعت میں شعر مشہور ہی ہے۔

کتب خانہ چند ملت بشت

تیمیہ کہ نا کردہ قرآن درست

اس بنا پر اس سے جو روایت ٹکرائے گی اگر ممکن ہے تو اس کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دیا جائے گا اور اگر یہ ممکن نہ ہوگا تو اس میں توجیہات و تاویلات کی جائے گی۔ خواہ وہ کسی ہی مکرر اور دور از کار کیوں نہ ہوں۔

بعض علما جو نہ بخاری کی مذکورہ بالا روایت کی صحت سے انکار کر سکتے تھے اور نہ اس میں کسی دور از کار تاویل کے روادار ہو سکتے تھے انہوں نے یہ کہا کہ حضور قرآن کی تصریح کے مطابق

شروع شروع میں تو بیشک امی تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن بعد میں آپ ان دونوں سے آشنا ہو گئے تھے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کی ایک اور آیت جس میں حضور کی امیت کا ذکر ہے اس میں "من قبلہ" کی تصریح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور نزول قرآن کے آغاز میں امی تھے یعنی نوشت و خواند نہیں کر سکتے تھے اور بس اس سلسلے میں ابن ابی شیبہ وغیرہ کی روایت تو یہاں تک ہے کہ

"مامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی کتب وقرأ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات،  
 اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک کہ آپ لکھ پڑھ نہیں لیتے تھے۔

مجالد نے حضرت شعبی سے اس روایت کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اس روایت میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو آیت کے منافی ہو۔ ابوالولید الباجی کو اس رائے پر اس درجہ صراحت تھا کہ انھوں نے اس پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا تھا اور جب علمائے اندلس نے ان کے اس خیال کی وجہ سے ان پر زندقہ کا الزام لگایا اور ایک شخص نے یہاں تک کہہ دیا۔

برئیت من شری دنیا باخرة وقال ان رسول الله قد کتبنا  
 (میں اس شخص سے بری ہوں جو آخرت کے بدلے میں دنیا کو خریدتا ہے اور کہتا ہے کہ بیشک رسول اللہ نے کتابت کی تھی) تو انھوں نے حاکم شہر کی موجودگی میں علمائے مناظرہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن وحیہ کے بقول علما کا ایک طبقہ ان کا ہم خیال بن گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابوالولید الباجی اور ان کے ہم خیال علما پر بھی اعتراض یہ وارد

۱۰ آیت یہ ہے "وما کنتم تتلو من قبلہ من کتاب ولا تحطہ بيمينک" (العنکبوت)

۱۱ فتح الباری ج ۷ ص ۲۰۵

۱۲ ایضاً

۱۳ تاج العروس ج ۸ ص ۱۹۱

۱۴ فتح الباری ج ۷ ص ۲۰۵



ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات و اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ صفات لازمہ ہیں جن کا کسی حال میں آپ کی ذات سے انفکاک نہیں ہوتا۔ اس بنا پر احمی کو بھی آپ کے لیے صفت لازمہ ہونا چاہیے اور اب اگر واقعی احمی کے معنی لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہیں تو عمر کی کسی منزل میں بھی آپ سے یہ صفت جدا نہیں ہو سکتی۔ علی الخصوص اس صورت میں جب کہ عام خیال کے مطابق آپ کی یہ صفت قرآن میں آپ کے لیے بطور معجزہ و دلیل نبوت بیان کی گئی ہو۔

بعض حضرات نے اس سلسلہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر صحیح حضور نے اپنے ہاتھ سے کتابت کی تھی مگر اس بنا پر نہیں کہ آپ کتابت کر سکتے تھے، بلکہ صرف اس لیے کہ خدا کو یہ بھی آپ کے ہاتھوں معجزہ دکھانا تھا کہ جو بالکل احمی اور کتابت سے نا آشنا تھا وہ اچانک لکھنے لگا۔ لیکن ظاہر ہے یہ قول بالکل لغو اور ناقابل اعتنا ہے، کیوں کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ایک معجزہ دوسرے معجزہ کی نفی اور تردید بھی کر سکتا ہے۔ اس صورت میں نفس معجزہ کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔

سطور بالا میں امیت کے اس معنی و مفہوم سے بحث تھی جو مسلمان خواص اور عوام دونوں میں عام طور پر مشہور و متداول ہیں۔ اس کے علاوہ اس لفظ کی بعض حضرات نے کچھ اور بھی تشریحات و توجیحات کی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم بتائیں کہ امیون اور احمی کا اصل مفہوم کیا ہے اور قرآن و حدیث میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ ان چند توجیحات کو بھی معلوم کر لینا چاہیے۔ یہ توجیحات حسب ذیل ہیں:

(۱) امی ام القری یعنی مکہ کی طرف منسوب ہے اور اس بنا پر حدیث میں جو "انامة امیة" ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امۃ مکیہ ہیں۔

لہ الروض الانف ج ۲ ص ۲۳۰

کہ اس حدیث وغیرہ پر مفصل کلام آگے آ رہا ہے

۱۲۸ حاشیہ صحیح مسلم مطبوعہ مکتبہ و مطبعہ محمد علی مصر ج ۲ ص ۱۲۸

( ۲ ) امی امت عرب کی طرف منسوب ہے اور اس بنا پر مراد یہ ہے کہ ہم عرب ہیں۔  
 ( ۳ ) بعض حضرات کے نزدیک امی ام سے مشتق ہے اور اس بنا پر امی اس شخص کو کہتے ہیں جو  
 دنیوی امور و معاملات سے ایسا بے تعلق اور بے خبر ہو کہ گویا وہ آج ہی پیدا ہوا ہے  
 کیوم ولدتہ امہ:

اب ان تینوں معنی پر غور کیجئے تو ان کی بے حقیقی بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ پہلی اور دوسری  
 توجیہ خاص حدیث مذکور میں چل جائے تو چل جائے قرآن میں جہاں جہاں امیون کا لفظ  
 آیا ہے وہاں نہیں چل سکتی۔ رہی تیسری توجیہ تو ظاہر ہے اس معنی کے اعتبار سے صحابہ کرام  
 کو امیون کہنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں وہ دنیوی معاملات میں بھی  
 بڑے عقلمند، معاملہ فہم اور زیرک و تجربہ کار تھے۔ کسی گروہ میں اگر تین چار آدمی بھولے  
 بھالے اور سیدھے سادے ہوں تو ان کی وجہ سے پورا گروہ اس صفت سے موصوف  
 نہیں ہو جاتا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے مفسرین اور علمائے  
 امی اور امیون کے جو معنی بیان کیے ہیں ان میں کوئی معنی اور کوئی مفہوم بھی ایسا نہیں ہے جو ہر  
 جگہ مراد لے لیا جائے اور جس پر کوئی اعتراض، کوئی ایراد اور کوئی شبہ وارد نہ ہوتا ہو۔ اب آئیے  
 خود قرآن اور حدیث کی روشنی میں غور کریں کہ درحقیقت ان الفاظ سے مراد کیا ہے؟  
 اصل یہ ہے کہ مذہبی اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب کے  
 لوگ دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جو اہل کتاب کہلاتے تھے۔ یہ کسی  
 نہ کسی پیغمبر کو بھی مانتے تھے۔ یہ طبقہ یہود و نصاریٰ و مجوس پر مشتمل تھا۔ اس کے بالمقابل دوسرا تھا  
 جو نہ پیغمبر سے باخبر تھا اور نہ کسی کتاب سماوی سے۔ اس بنا پر یہ طبقہ پہلے طبقہ کی نسبت زیادہ  
 شدید گمراہی میں مبتلا تھا۔ بت پرستی کرتا تھا، شرک میں مبتلا اور رذائل اخلاق کا جو گرتھا۔ یہی  
 وہ طبقہ ہے جسے قرآن امیون کہتا ہے۔ اس بنا پر امیون کے معنی میں وہ لوگ جو پہلے سے کسی

کتاب الہی اور پیغمبر سے آشنا نہ ہوں۔ اس بنا پر ظاہر ہے جو شخص اس طبقہ سے تعلق رکھے گا، ان میں پیدا ہوگا اور ان میں رہ کر نشوونما پائے گا وہ امی کہلائے گا۔ اس لفظ کا تعلق نشت و خواند سے ہرگز نہیں ہے۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ صرف ہمارا قیاس و تخمین نہیں ہے۔ بلکہ ترجمان قرآن حضرت عبداللہ بن عباس نے امیون کی یہی تشریح کی ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری کا بیان ہے۔

”عن ابن عباس“ ومنہم امیون“  
 قرآن میں جو ”ومنہم امیون“ ہے اس کے متعلق ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: امیون وہ لوگ ہیں جنہوں نے کبھی نہ کسی رسول کی تصدیق کی جسے اللہ نے بھیجا ہو اور نہ کبھی ایسی کتاب پر ایمان لائے جسے اللہ نے اتارا ہو۔

لیکن چونکہ حضرت ابن عباس کی یہ تفسیر مفسرین کے مذاق عام کے خلاف تھی اس لیے طبری نے اس کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

”وہذا التاویل تاویل علی خلاف ما یعرف من کلام العرب المستفیض بینہم وذاک ان الامی عند العرب هو الذی لا یتب“  
 اور (ابن عباس کی) یہ تاویل اس کے خلاف ہے جو کلام عرب میں مشہور ہے اور وہ یہ کہ امی عرب اس کو کہتے ہیں جو لکھنا نہ جانتا ہو۔

لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی سند اور دلیل کیلئے کہ عرب امی اسی شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا نہ جانتا ہو اور اس کے برخلاف یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کلام عرب کے اتنے بڑے رمز شناس و نکتہ داں تھے کہ صحابہ میں ان جیسے کم ہی ہوں گے حضرت عمر خود اس فن کے ماہر تھے۔ لیکن آپ کو بھی جب ضرورت پیش آتی تھی تو حضرت ابن عباس سے ہی رجوع کرتے تھے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ خود قرآن سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ سورہ آل عمران میں ایک آیت ہے جس میں اہل کتاب اور امیون دونوں کو عطف کے ذریعہ ایک

ساتھ ذومتقابل گروہ کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

”وقل للذین ادتوا الكتاب والامیین  
 اٰسلمتم فان اسلموا فقد اهتدوا. وان  
 تولوا فانما علیک البلاغ واللہ بصیر  
 بالعباد“ (آیت نمبر ۲۰)

جن لوگوں کو دی گئی ہے کتاب اور جو امی ہیں  
 آپ ان دونوں سے کہہ دیجئے کہ کیا تم اسلام لے  
 آئے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئے ہیں تو انھوں نے  
 ہدایت پالی۔ اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو بس  
 آپ پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں  
 کو خوب دیکھتے والا ہے۔

غور کیجئے اس آیت سے کس قدر واضح طریقہ پر معلوم ہوتا ہے کہ امیوں اہل کتاب کے بالمقابل  
 ایک خاص طبقہ اور گروہ کا نام ہے اور چونکہ اہل کتاب وہ لوگ ہیں جو کتاب الہی کی تلاوت کرتے  
 (وہم یتلون الکتاب)، اس پر اور پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے امیوں وہ لوگ کہلا سکیں گے جو  
 ایسے نہیں ہوں گے۔ یہ اس قدر واضح اور صاف بات ہے کہ جو حضرات امیت کے معنی نوشت  
 وخواند سے عاری ہونا قرار دیتے ہیں انھوں نے بھی اس جگہ امیوں سے مراد مشرکین و وثنیوں  
 لیے ہیں۔ دو چار بے پڑھے لکھے آدمی ہر گھر اور ہر خاندان میں ہوتے ہیں، اس لیے ان سے کوئی  
 ایک خاص طبقہ الگ نہیں بنتا اور اگر بنتا بھی ہوتا تو دینی و مذہبی سماج کی دنیا میں ہرگز اس کی اتنی  
 اہمیت نہیں ہو سکتی تھی کہ قرآن میں اس کو اہل کتاب کے متقابل دستواری کی حیثیت سے ذکر  
 کیا جاتا۔

اب سورہ البقرہ کی آیت:

”ومنہم امیون لا یعلمون الکتاب  
 الا امانی وان ہم الا یظنون ہ فویل للذین  
 یکتبون الکتاب باید یحکم ثم یقولون ہذا من  
 عند اللہ لیشتروا بہ ثمنًا قلیلًا“ فویل لہم

اور ان (یہود) میں بعض لوگ ہیں جو امی  
 ہیں یہ سوائے من مانی باتوں کے کتاب کو نہیں  
 جانتے اور لگان سے کام سے لیتے ہیں۔ پس  
 ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے

ملہ دیکھئے اس آیت کے تحت تفسیر ابن جویر، ابن کثیر، روح المعانی، المنار، القاسمی وغیرہ

مَا كُتِبَ اِيْدِيْهِمْ وَّوَيْلٌ لَّهُمْ مَّا يَكْسِبُوْنَ ۝  
(نمبر ۷۸-۷۹)

کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ کچھ پیسے کمالیں۔ پس جو کچھ ان کے ہاتھوں نے لکھا ہے اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے اور جو کچھ انھوں نے کمایا ہے اس کی وجہ سے ان کے لیے بربادی ہے۔

ملاحظہ فرمائیے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ان آیات میں ان یہود کا ذکر کیا گیا ہے جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ ہم اہل کتاب ہیں، مگر حالت یہ تھی کہ اہل کتاب الہی کا جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی ان کو خاک علم نہیں تھا۔ چند من مانی باتیں تھیں جن پر یہ لوگ ایمان رکھتے تھے اور ان کا سرچشمہ علم ان کا ظن تھا۔ پھر لوگوں کو دھوکہ دینے اور ان سے مانی منفعت حاصل کرنے کی غرض سے انہی من مانی باتوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ لیتے اور ناواقف لوگوں کے سامنے انھیں پیش کر کے کہتے: دیکھو یہ ہے کتاب الہی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر کے ان کی اہل حقیقت بے نقاب کرتا ہے، تاکہ لوگ ان کے فریب کا شکار نہ ہوں۔ غور کرنا چاہیے کہ ان آیات سے بھی کس قدر واضح طریقہ پر معلوم ہوتا ہے کہ امتیت کا دار و مدار کتابت سے نا آشنا ہونے پر نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ نوشت و خواند تو جانتے تھے اور اس بنا پر قرآن کی تصریح کے مطابق یہ من مانی باتیں اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ بلکہ امتیت کا اصل وصف امتیازی اور اس کا حقیقی مفہوم کتاب الہی کا علم نہ ہونا ہے۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ سرے سے ان کو اس کا علم ہی نہ ہو یا علم تو ہو مگر یہ اس کا اخفا کرتے ہوں یا اس میں تحریف و تاویل باطل سے کام لیتے ہوں۔ فن بلاغت کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان دونوں صورتوں پر عدم علم کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

یہ (چند یہود) اپنے ہاتھ سے ایک  
نوشتہ لکھتے تھے اور پھر جاہل اور بے خبر لوگوں  
سے کہتے تھے: یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے۔  
ان لوگوں کو امیین اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ  
اور اس کے رسول کی کتابوں سے سرکشی کرتے  
تھے۔

«فکتبوا کتاباً بایديهم ثم قالوا  
لقوم سفلة جهال: هذا من عند الله  
ثم سماهم اميين، ليجحدوهم كتب الله  
ورسوله!»

حضرت مجاہد جو مشہور تابعی مفسر ہیں ان سے بھی یہی منقول ہے۔ فرماتے ہیں:

بے شبہ امیین جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت  
میں ان کے اوصاف کے ساتھ بیان کیا ہے  
وہ لوگ ہیں، جو حضرت موسیٰ پر اللہ نے جس  
کتاب کو نازل کیا تھا اسے کچھ نہیں سمجھتے تھے  
بلکہ غلط سلط اور جھوٹ اور لغو باتوں کے  
ہوائی تیر چلاتے تھے۔

«ان الاميين الذين وصفهم الله  
بما وصفهم به في هذه الآية، انهم  
لا يفقهون من الكتاب الذي انزله الله  
على موسى شيئاً، ولكنهم يتخرون  
الكذب ويقولون الا باطيل كذباً و  
زوراً!»

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ کتاب الہی کا علم نہیں رکھتے ان کے بے امیون کی اصطلاحاً  
خود قرآن کی ایجاد کردہ نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کی ہے۔ یہ لوگ اپنے اہل کتاب ہونے کے  
زعم میں سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کا ایک منتخب برگزیدہ و ممتاز گروہ ہیں جیسا کہ قرآن میں بھی ان کے  
اس زعم باطل کی طرف جا بجا اشارے ہیں۔ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ جو کتاب اور  
رسول سے نا آشنا تھے ان کو یہود امیین کہتے تھے جس کے معنی ان کے ہاں الغر با تھے۔ ڈاکٹر  
جو اد علی لکھتے ہیں:

تفسیر ابن جریر طبری ص ۲۵ ص ۲۵۹

تفسیر ابن جریر ص ۶۶۲

تفسیر المشرق جزء تشریح الثانی ص ۱۹۳ ص ۸۲۰

یہود اپنے عرب پڑوسیوں کو امیون کہتے تھے اور اس سے مراد وہ لوگ نہیں تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے جیسا کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں بلکہ یہ (یہود) اس لفظ کو قوم "کویمیم" یا "جویمیم" بہ معنی الغریبا کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ خدا نے ان کو وحی، نبوت اور انبیاء سے سرفراز کیا ہے اس لیے یہ ایک منتخب گروہ ہیں۔ ان کے برخلاف دوسرے لوگ ان چیزوں سے محروم ہیں اس لیے وہ غریبا ہیں..... اور اس لفظ کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو یہودی نہیں ہوتا تھا۔ پس یہ لفظ امی عبرانی زبان کے لفظ گوی (GOI) کا مترادف اور یونانی زبان کا لفظ (ETHNOS) کے مقابل ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اب اس کی روشنی میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت جس میں حضور کی بعثت فی الامیین کا تذکرہ ہے پڑھیے تو اس کا مطلب اس معنی و مفہوم سے مختلف نکلتا ہے جو اب تک عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، آیت یہ ہے:

”هو الذی بعث فی الامیین رسولا  
منہم یتلوا علیہم آیتہ و یرکبہم وعلیہم  
الکتب و الحکمۃ وان کانوا من قبل  
لفی ضلال مبین“  
یہ وہ خدا ہے جس نے امیون میں سے ایک  
رسول کو مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیات  
تلاوت کرتا ہے اور ان کا تذکرہ کرتا ہے اور  
ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ اس  
سے پہلے یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔  
(الجمعة ۳۰۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی ایک نشانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور ایک دلیل نبوت کے بیان فرماتا ہے کہ دیکھو، حضور کی ولادت، نشوونما اور بعثت عرب کے ان لوگوں میں ہوئی جو نہ کتاب الہی کا علم رکھتے تھے اور نہ کسی پیغمبر اور وحی سے آشنا تھے اور اس بنا پر کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔ یعنی نہ خدا کو جانتے تھے، نہ روزِ حشر کو مانتے

تھے، پھر جیسی بیجان چیزوں کو اپنا معبود یقین کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ بیشک اس زمانہ کے یہود اور نصاریٰ بھی گمراہ اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے تھے۔ مگر ان کی گمراہی اس درجہ کی نہیں تھی، وہ خدا، کتاب الہی، پیغمبر اور وحی سے تو آشنا تھے۔ قرآن مجید کو بغور پڑھے تو صاف نظر آئے گا کہ ضلالِ مبین، کے الفاظ مشرکین کے لیے ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف جب وہ اہل کتاب کو خطاب کرتے ہیں تو کہتا ہے:

”تعالوا الی کلمۃ سوا بیننا و بینکم“

اؤ تم اس کلمہ کی طرف جو ہم میں اور تم میں

مشترک ہے۔

پھر ان کی صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ کتاب اللہ کی ملاوت بھی کرتے اور پیغمبروں پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ غرض کہ اس آیت میں ”لفی ضلال“ مبین بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ (امیین) وہ لوگ ہیں جو کچھ جانتے ہی نہیں اور کسی بات کا بھی علم نہیں رکھتے اللہ کی یہ نشان ہے کہ وہ ایسے ہی لوگوں میں ایک پیغمبر مبعوث کرتا ہے جو ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور تطہیرِ نفس کرتا ہے، ورنہ قرآن میں بہت سی باتیں توراہ و انجیل اور کتبِ قدیمہ کی ہیں۔ شام کے سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات تھوڑی سی دیر کے لیے بحیرتی راہب سے ہو گئی تھی تو اس کا توبہ زبانوں اور دشمنوں نے یہ فضیحت کیا۔ اگر کہیں آپ اہل کتاب میں پیدا ہو جاتے اور ان لوگوں کے درمیان آپ کی نشوونما اور تربیت ہوتی تو پھر خدا جانے کیا کچھ نہیں کہتے۔ پس اللہ کی آیت اور حضور کی نبوت کی دلیل یہ ہے کہ کتاب اور رسول کا علم نہ رکھنے والی قوم میں پیدا ہوئے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ اس چیز کا ہرگز اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں اور نہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس کو بطور معجزہ پیش کیا جائے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو نوشت و خواند سے عاری ہونے کے باوجود نہایت عقلمند، بڑے فرزانہ اور اعلیٰ درجہ کے مدبر اور سیاست دان ہوتے ہیں۔ ہم نے خود بعض ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ایک حرف لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور اس کے باوجود بہترین قسم کے شاعر تھے۔ اس بنا پر ایک ناخواندہ انسان کا معجزہ یہ ہو گا کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے ایک کتاب لکھ کر آپ کو دے دے یا یہ ہو گا کہ وہ حکمت کی باتیں آپ کو بتائے،



قرآن میں اسی حقیقت کو جو ہم نے بیان کی ہے واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا،

”وما کنت تملوا من قبلہ من کتب ولا تخطہ بعیینات اذا اذنا ب المبتلون“  
 اور آپ اس سے پہلے نہ کسی کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بیشک اہل باطل شک کرتے۔ (العنکبوت ۶۸)

مفسرین عام طور پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ امیت کے معنی لکھ پڑھ نہ سکتا ہیں حالانکہ جیسا کہ اور بیسیوں آیات میں کتاب کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے۔ یہاں بھی کتاب سے ہر کتاب یا نوشتہ نہیں بلکہ صرف کتاب الہی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کی بعثت ان لوگوں میں ہوئی تھی جو کتاب کا علم نہیں رکھتے تھے اس لیے آپ نبوت سے پہلے نہ کسی کتاب سماوی کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر بیشک اہل باطل شک کر سکتے تھے۔ اس آیت میں مطلق قرأت اور کتابت کی نہیں بلکہ خاص کتاب الہی کی تلاوت اور اس کی کتابت کی نفی کی گئی ہے چنانچہ اس آیت کا سیاق و سباق جس میں اہل کتاب اور ان کی کتابوں اور قرآن کا تذکرہ ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے علاوہ بریں اسی مضمون کو ایک اور آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ یہاں مطلق قرأت و کتابت کی نفی ہرگز مراد نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان“  
 آپ نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو

(شوری ۵۲)

اس آیت میں کتاب کا معنی باللام ہونا اور الایمان کے ساتھ اس کا مذکور ہونا اس بات کی برہان قاطع ہے کہ کتاب سے مراد کتاب الہی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورہ عنکبوت کی آیت میں جو کتاب کا لفظ

لہ مثلًا سورہ الاحقاف کی آیت ”ایتونی بکتب من قبلہذا“ اور ”وہذا“ میں کتاب سے مراد کتاب اللہ اور علم سے مراد علم انبیاء ہے۔

ہے اس سے مطلق کتاب نہیں بلکہ کتاب خاص مراد ہے، کیونکہ "القرآن لیسر بعضہ بعضاً" کا اصول اسی قسم کے مواقع کے لیے ہے۔ اب مزید غور کیجئے تو سورہ عنکبوت کی آیت سے مطلق کتابت کی نفی تو کیا ثابت ہوتی اور اٹا حضور کے لیے نفس کتابت کا ثبوت ملتا ہے۔ منطق کا مشہور مسلمہ ہے کہ سلب موضوع نفس وجود موضوع کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب یہ فرمایا گیا کہ آپ کسی کتاب الہی کی کتابت نہیں کرتے تو اس سے ضمناً اس پر دلالت ہوگئی کہ آپ کتابت کر سکتے تھے۔ ایک نابینا سے یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ تم نے تاج محل کبھی نہیں دیکھا، چنانچہ بخاری کی واقعہ حدیبیہ والی روایت جس پر ہم گفتگو کر چکے ہیں اس کے علاوہ بھی متعدد روایات ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صرف کتابت سے آشنا ہی نہیں تھے بلکہ اس فن کے رمزدان و نکتہ شناس بھی اس درجہ کے تھے کہ امیر معاویہ جیسے مشہور کاتب کو بعض اوقات ہدایت فرماتے تھے کہ دیکھو، ب کو سیدھا کرو۔ اس کے دندلے بناؤ۔ "م" کو ٹیڑھا مت کرو اور "بسم اللہ" کو زیادہ مت کھینچو۔

جمہور علماء جو امیت کے عام متداول اور مشہور معنی مراد لیتے ہیں ان کا سب سے بڑا استدلال سورہ عنکبوت کی اسی آیت سے ہے جس پر ہم نے ابھی کلام کیا۔ اب ہم ان روایات پر گفتگو کریں گے جن سے امیت کے اس معنی پر استدلال کیا جاتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری کے بالکل شروع میں باب بدء الوحی کے ماتحت جو مشہور حدیث ہے اس میں ہے کہ جب فرشتہ آنحضرت علی اللہ علیہ وسلم کے پاس غار حرا میں آیا تو اس نے کہا: "اقراء" (پڑھ)۔ آپ نے فرمایا: "ما انا بقارئ" (میں قاری نہیں ہوں)۔ اب فرشتہ آپ سے چمٹ گیا اور پھر اس نے وہی اقرار کیا اور آپ نے دوسری مرتبہ بھی وہی جواب دیا، یہاں تک کہ تیسری بار فرشتہ نے کہا: "اقراء باسم ربك الذی کلاية" تو حضور نے اس کو جس طرح سنا تھا اسی طرح دہرایا۔ اس روایت میں حضور کے ارشاد "ما انا بقارئ" سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپ کو قرأت نہیں آتی تھی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو پیش نظر رکھنی چاہئے یہ ہے کہ جس طرح ہماری زبان

اردو میں پڑھنے کے دو معنی آتے ہیں ایک کسی کتاب کسی مضمون یا کسی تحریر کا پڑھنا اور دوسرے زبانی یاد سے کچھ سنانا۔ مثلاً ہم کہتے ہیں اس بچے نے ایک نظم پڑھی۔ انگریزی زبان میں پہلے معنی کے لیے *To Read* اور دوسرے معنی کے لیے *To Recite* کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح عربی میں لفظ قرأت بھی ان دو معنوں میں مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب فرشتہ نے حضور سے "اقرأ" کہا تو اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ فرشتہ آپ سے کسی لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کی درخواست کر رہا تھا۔ اس بنا پر "اقرأ" سے یہاں مراد اردو میں زبانی پڑھنا یا پڑھنا ہی ہو سکتی ہے اور اس کا قرأت بمعنی کتاب پڑھنے سے کوئی تعلق بہرگز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں اس میں اختلاف ہے کہ "ما انا بقادی" میں ما کا لفظ نافیہ ہے یا استفہامیہ اگرچہ عام رجحان یہی ہے کہ نافیہ ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اس کو ہی ترجیح دی ہے لیکن اس موقع پر بعض روایات میں "ما انا بقادی" کے بجائے "کیف اقرأ" (میں کیوں کر پڑھوں) اور "ماذا اقرأ" (میں کیا پڑھوں) کے الفاظ منقول ہیں اور بقول حافظ ابن حجر کے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بخاری کی اس روایت میں ما نافیہ نہیں بلکہ استفہامیہ ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب تک فرشتہ صرف "اقرأ" کہتا رہا آپ اپنے الفاظ دہراتے رہے لیکن جو یہی فرشتہ نے آیت پڑھی آپ نے اس کو زبان مبارک سے ادا فرمادیا۔

(۲) ان حضرات کا دوسرا استدلال حدیث ذیل سے ہے:

"نحن امة امة لانکتب ولا نحسب" ہم امی لوگ ہیں، نہ کتاب جانتے ہیں اور

نہ حساب۔

یہ روایت صحیح بخاری، مسلم، نسائی اور مسند احمد بن حنبل سب میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے اور روزہ سے متعلق ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں ماہ و سال کی تعیین کے لیے کوئی خاص تقویم یا خبرتزی مروج نہیں تھی کچھ لوگ

۱۹ ص ۱۹

صحیح بخاری کتاب الصوم باب قول النبی لانکتب ولا نحسب

تقویم شمسی پر عمل کرتے تھے اور کچھ لوگ تقویم قمری پر۔ اسلام میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو اب یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ مہینہ اور اس کے دنوں کی تعیین کس طرح کی جائے؟ اہل کتاب کے ہاں تقویم شمسی کا رواج تھا۔ لیکن اس میں دقت یہ تھی کہ اس میں باقاعدہ حساب کتاب رکھنا پڑتا تھا اور باقاعدہ عمل وہیں ہو سکتا تھا جہاں دفتری نظم و نسق کا اہتمام کیا جاتا ہو۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام سہولت اور آسانی کے پیش نظر قمری تقویم کو اختیار فرمایا۔ اور ارشاد ہوا: سیدھی سی بات ہے، چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ اس میں مصلحت یہ بھی تھی کہ رمضان کا مہینہ ہمیشہ کسی ایک موسم میں نہ آئے بلکہ اوتنا بدلتا رہے۔ اب اس میں منظر کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو حدیث کے الفاظ کا ٹھیکٹا اردو ترجمہ یہ ہو گا کہ ہم لوگ امی ہیں حساب کتاب نہیں رکھتے۔ یہاں اصل مقصد بیان کرنا حساب کا ہے جس سے مراد تاروں کی نقل و حرکت (تیسیر نجوم) کا حساب ہے اور کتاب کا لفظ محض تابع غیر مقصود کی حیثیت سے مستعمل ہوا ہے جیسا کہ اس قسم کے موقع پر اردو میں بھی ہوتا ہے۔ اس سے نفس کتابت دانی کی نفی پر کہاں دلالت ہوئی؟ چنانچہ حافظ ابن کثیر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

نحن امة امیة... ای لا نفتقر فی ہم ایک امت امیہ ہیں یعنی اپنی عبادت اور عبادتنا و مواقیبھا الی کتاب و حساب " اس کے اوقات میں ہم کو حساب کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ گویا حدیث میں امیۃ کا لفظ! تو ایک نکتہ دان بلاغت جانتا ہے کہ اس جگہ یہ لفظ بطور صفت تجرید کے استعمال ہوا ہے یعنی امی دراصل وہ لوگ ہیں جو کتاب الہی کا علم نہیں رکھتے جنہوں نے یہاں اس لفظ کو مطلق کتاب سے آشنا نہ ہونے یا بالفاظ دیگر صاف پاٹ سیدھے سادے ہونے کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ یہ صرف بلاغت کا ایک اسلوب بیان ہے نہ کہ کسی چیز کا مدار حکم (۳) ایک اور روایت ہے جو ابی بن کعب سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم جبریل سے ملے اور فرمایا:

”یا جبریل! انی بعثت الی امة

امین منهم العجوز والشیخ الکبیر والغلام  
والجارية والرجل الذی لم یقرأ کتاباً قط۔

قال: یا محمد ان القرآن انزل علی سبعة  
احرف“

اے جبریل! میں امی لوگوں میں مبعوث کیا گیا  
ہوں۔ ان میں بوڑھی عورتیں بھی ہیں اور بوڑھے  
مرد بھی، لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی اور وہ لوگ  
بھی جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے جبریل  
نے کہا: اے محمد! بے شبہ قرآن سات احرف (یعنی  
قرارات) پر نازل کیا گیا ہے۔

اس روایت میں ”الرجل الذی لم یقرأ کتاباً“ سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں کہ امیت  
کے معنی قرأت و کتابت سے نا آشنا ہونا ہیں۔ لیکن ادنی تاہل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی قرأت  
سے مراد زبانی کسی چیز کا پڑھنا ہے نہ کہ کسی کتاب کو دیکھ کر پڑھنا! اور حضور کا مطلب وہی ہے کہ  
میں پیدا تو ان لوگوں میں ہوا ہوں جو کسی کتاب الہی سے آشنا نہیں اور اس لیے اس کی تلاوت  
کے آداب و رسوم کیا ہیں؟ اس کے بعض خاص مصطلحات اور الفاظ کا تلفظ کس طرح ہونا چاہیے؟  
ان چیزوں سے وہ واقف ہی نہیں، چنانچہ جبریل نے جو جواب دیا وہ اسی چیز سے متعلق تھا۔ انہوں  
نے کہا: قرآن میں نو سات قرأتیں ہیں۔ اگر ان میں کچھ لوگ ایک قرأت سے الفاظ ادا نہیں  
کر سکیں گے تو دوسری قرأت سے کریں گے۔ اس میں کوئی بات تشویش کی نہیں ہے۔ ظاہر ہے  
اس تشریح کے ماتحت قرأت و کتابت بہ معنی نوشت و خواند کا اس حدیث میں کوئی تذکرہ نہیں  
کہ اس سے امیت کے اس معنی زیر بحث کے لیے استدلال کیا جاسکے۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ امین کا لفظ آیا ہے اور وہاں بھی اہل کتاب کے مقابل کی حیثیت  
سے ان کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

”ومن اهل الكتب من ان تامنه

بقنطار یؤده الیک ومنهم من ان تامنه

اور اہل کتاب میں لوگ بعض تو ایسے ہیں کہ  
اگر آپ ان کے پاس دروپیوں کا ایک ڈھیر

جامع الترمذی کتاب ابواب الفرائد باب ماجاء انزل القرآن علی سبعة احرف

بھی امانت رکھیں تو وہ آپ کو لوٹا دیں گے احد  
بعض ان میں ایسے ہیں کہ اگر آپ ایک دینار بھی  
ان کے پاس امانت رکھیں گے تو جب تک آپ ان  
کے سر پر ہر وقت کھڑے ہی نہ رہیں وہ نہ لوٹائیں گے  
ان کا یہ طرز عمل اس لیے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ امین  
کا ہم پر کوئی بس نہیں چلتا اور یہ لوگ اللہ پر چھوٹ  
باندھتے ہیں درآنحالیکہ (جو بات حق ہے اسے) یہ  
خود جانتے ہیں۔

بدینا دلکایو دکالیك الاما دمت علیہ  
قائما ذالک بانہم قالوا لیس علینا  
فی الامیین سبیل وبقولہ علی اللہ  
الکذب وہم یعلمون  
(آل عمران آیت ۷۵)

غور کیجئے! اس آیت سے کس طرح صاف ظاہر ہے کہ اہل کتاب اپنے علاوہ عرب کے تمام  
لوگوں کو امیون کہتے تھے۔ اور کتاب الہی وغیرہ سے چونکہ یہ لوگ آشنا نہیں تھے اس لیے ان کو اس درجہ  
حقیر و کم بایہ سمجھتے تھے کہ بدعہدی اور خیانت کا ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی ان کو بائک نہیں ہوتا تھا  
جس پر خدا نے ان کو تنبیہ کی۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ ہمارے مفسرین میں بھی بعض حضرات اس حقیقت سے باخبر تھے چنانچہ  
صاحب تفسیر المنار سید رشید رضا لکھتے ہیں:-  
”وکان اهل کتاب یسمون  
العرب بالامیین ولعلہ کان لہ  
لاهل الحجاز ومن جاوہرہ من اهل الیمین“  
اور اہل کتاب نے عربوں کا نام امیون رکھ چھوڑا  
تھا اور غالباً یہ یمن کے لوگوں کو نشانی کر کے حجاز کے  
لوگوں اور ان کے پڑوسیوں کا لقب تھا۔

جیسا کہ گزر چکا ہے۔ لفظ کی اصل کیا ہے؟ اس سلسلے میں متعدد اقوال نقل کیے جاتے ہیں  
لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ لفظ خالص عربی ہے اور کسی عبرانی لفظ سے اس کا پیوند نہیں ہے  
تو یہ ام الرما سے بنایا گیا ہے اور امی اب وہ لوگ ہوئے جو ام القری یعنی مکہ کے رہنے والے  
ہوئے اور بعض حضرات نے یہ لکھا بھی ہے کہ اس صورت میں امیون میں وضع لغوی کے اعتبار سے

تو مقامی نسبت ہوئی مگر ان کی خصوصیت وہی کتاب الہی کا عدم علم رہی جس کے باعث یہود ان کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔

قرآن سب سے بڑا عالم انسانیت کا ایک عظیم معجزہ ہے جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہوا ہے۔ اور یہ دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، معنی و مطلب کے اعتبار سے اور الفاظ و نظم کلام کے اعتبار سے بھی پہلی حیثیت کو اس طرح واضح کیا گیا کہ سورہ الاعراف کی دو آیتوں میں یکے بعد دیگرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت الای بھی بیان کی گئی ہے یعنی ایک ایسا پیغمبر جس کے نہ خاندان میں اور نہ عزیزوں قریبوں میں کوئی پیغمبر تھا، جو نہ خود کتب الہیہ سے واقف تھا، اور نہ جس کی پیدائش اور تربیت کتب الہیہ کا علم رکھنے والے لوگوں میں ہوئی تھی۔ پھر اس کی زبان سے علوم اولین و آخرین کے حقائق بیان ہوتے ہیں۔ تو غور کرو یہ کیونکر ہوتے ہیں؟ اور ان سب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اہل کتاب کو خصوصاً اور دوسروں کو عموماً اس پر حیرت و استعجاب ہو سکتا تھا کہ ایک امی کی زبان سے کتب الہیہ قدیمہ کے حقائق کیوں کر بیان ہو رہے ہیں تو قرآن نے کہا اس پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ یہ امی پیغمبر ہے۔ ورتہم لوگوں کے لیے اس لیے جنسی نہیں ہے کہ خود تمہاری کتابوں میں اس کا ذکر اور اس کے آنے کی بشارتیں مرقوم موجود ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

«الذین یتبعون الرسول لنبی ؑ وہ یؤکد جو اس امی رسول و نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراہ و انجیل میں لکھا ہوا ہے»  
 الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندہم  
 فی التوراة و الانجیل (۱۵۸)

توراہ و انجیل کی ان بشارتوں کا تذکرہ بہت سی کتابوں میں ہے لیکن ہمارے نزدیک اس پر سب سے زیادہ جامع کتاب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی "اظہار الحق" ہے۔ سید بدرخان نے بھی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں متعدد صفحات میں مولانا کیرانوی کی اسی کتاب کے حوالے سے بشارت نقل کی ہیں ان میں ایک بشارت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت اور بعثت رسیم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ صاحب المنار نے اس کی تشریح میں قرآن مجید کی آیت "هو الذی بعد" سے نقل بھی کی ہے۔ وہ بشارت جو کتاب استثنائے باب ۳۲ کی اکیسویں آیت ہے حسب ذیل ہے:

"خدا نے کہا کہ ان لوگوں نے غیر خدا کو خدا مان کر اور اپنے معبودات باطلہ میں الجھ کر میری

غیرت کو بھڑکایا اور مجھ کو غصہ دلایا ہے تو میں بھی اس کا بدلہ ان لوگوں کے ذریعہ لوں گا جو غیر مشعب ہوں گے اور جاہل طبقے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔

سید رشید رضا کہتے ہیں کہ یہود اپنے آپ کو مشعب کہتے تھے اور اپنے علم پر مغرور تھے اس لیے "غیر مشعب" اور "جاہل طبقہ" سے وہی لوگ مراد ہیں جن کو قرآن "امیین" کہتا ہے۔  
بس گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ایست قرآن مجید کے باعتبار معانی و مطالب معجزہ و کلام الہی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اب رہا قرآن کا باعتبار زبان و الفاظ معجزہ ہونا تو اس کو اس طرح بیان فرمایا گیا۔

و لقد تعلمنا ہم یقولون انما علمہ  
بشر لسان الذی یلحدون الیہ العجمی و  
هذا لسان عربی صبین  
اور ہم جانتے ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (محمد) کو ایک شخص سکھاتا ہے مگر جس کی طرف یہ تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔  
(النحل آیت ۱۰۳)

مکہ میں ایک غلام تھا اس کے نام کے بارہ میں اختلاف ہے عبداللہ بن عباس بلعام بتاتے ہیں اور عکرمہ عیش۔ اس کے علاوہ بعض حضرات نے حیر اور ابو نکیبہ بھی نام بتائے ہیں۔ بہر حال حضور کا اس کے یہاں آنا جانا تھا۔ یہ شخص کچھ بکھا پڑھا تھا، اس لیے دشمنوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ غلام آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ خدا اس تہمت و الزام کی تردید کرتا ہے تو معانی و مطالب کے لحاظ سے قرآن کے کلام الہی ہونے کو حضور کی صفت امی کے ذریعہ بیان کر ہی چکا تھا۔ صرف زبان اور الفاظ کا معاملہ رہ گیا تھا۔ اسے اس آیت میں صفائی کے ساتھ بیان کر دیا گیا کہ اس شخص کی زبان انجلی غیر فصیح اور یہ عربی صبین؟ جس کی ایک سورت کیا ایک آیت کا مثل بھی عرب کے بڑے بڑے نامور متحدہ سعی و کوشش کے باوجود پیدا نہیں کر سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت امی کے جو معنی ہم نے متعین کیے ہیں یعنی کسی کتاب الہی کا علم نہ ہونا، قرآن مجید میں اسی کو ایک مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:



ووجدك ضالاً فهدى ( واضحی ) اور خدا نے آپ کو ضال پایا تو ہدایت دی۔

مفسرین کو اس آیت کی تفسیر میں بڑا اشکال پیش آیا ہے لیکن بات بالکل صاف اور ظاہر ہے۔ آپ کی بعثت جن لوگوں میں ہوئی وہ "امیین" تھے اور آپ "احی" تھے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق یہ "امیین" بعثت محمدی سے قبل ضلال مبین میں تھے تو حضور بھی خلعت نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے "ضال" تھے۔ نبوت سے پہلے کتاب الہی کے عدم علم میں عرب کے یہ امیین اور حضور دونوں برابر تھے اس لیے "ضلال" کا اطلاق دونوں پر ہوا مگر امیین اس سے آگے بڑھ کر ذلیل اعمال، اخلاق فاسدہ اور شرک و بت پرستی میں بھی مبتلا تھے اس لیے ان کا یہ "ضلال" "ضلال مبین" تھا اور ان کے برخلاف حضور نبوت سے پہلے بھی ان تمام چیزوں سے مبرا و منزہ تھے اس لیے قرآن میں عدم علم کتاب الہی کی وجہ سے آپ کو صرف "ضال" کہا گیا۔

اس مضمون میں صرف امی اور امیون کے صحیح معنی و مفہوم کو متعین اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بس۔ رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا پڑھا آتا تھا یا نہیں؟ ہم کو نہ اس پر اصرار ہے اور نہ اس سے انکار کیونکہ رسمی طور پر چند حروف کی شکل و صورت اور ان کے پیچ و خم سے آشنا ہونا یا نہ ہونا فی نفسہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی انسان کے لیے کوئی بڑا معیار کمال و نقص بن سکے۔ اصل چیز دماغ روشن، دل بیدار اور حساس و دراک فہم ہے۔

# آٹھویں صدی ہجری کے اندلسی شعرا کا ایک تذکرہ

سلاطین غرناطہ (بنو احرار) کا مشہور وزیر، ذوالوزاتین سان الدین بن الخطیب اسلمانی (۷۱۳-۷۷۶ھ) نہ صرف سیاسی نقطہ نگاہ سے بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی اور اپنے تاریخی و ادبی آثار کے اعتبار سے بھی ہماری تاریخ کی شخصیات بارزہ میں سے ہے۔ وہ اپنے وقت کا بے نظیر انشا پرداز، مہجر، نگار شاعر اور نکتہ سنج ادیب تھا۔ طب و فلسفہ میں بھی اس کا مطالعہ ہمہ گیر و محققانہ تھا، طب میں الوصول لحفظ الصحة فی الفصول اس پایہ کی تصنیف تھی کہ اس کے متعلق خود ہی بیاختہ لکھتا ہے لم یولف مثله فی الطب۔ تاریخ و تراجم میں اس کے قلم سے جتنی کتابیں نکلیں ان میں سے الاحاطة اور اللحة البدیة وغیرہ اب رواج پذیر ہو چکی ہیں۔ اور ان کتابوں کو دیکھنے کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ابن الخطیب کی ان تاریخی و ادبی تصانیف کے بغیر غرناطہ کی علمی،

۱۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو: ابن خلدون ج ۴، ص ۳۳۲-۳۳۶، ص ۳۴۱ (طبع ۱۲۸۲ھ بلاق)؛ ابن حجر الدرر الكامنة ج ۳ ص ۲۶۹-۲۷۲ (حیدرآباد)؛ نفح الطیب ج ۳ و ۴؛ انائیکلو پیڈیا آف اسلام: ج ۲ ص ۳۹۷ (مضمون نگار: C.F. Seglold)؛ فلپ حتی، History of the Arabs: CH. XL. ۶۵۶-۶۵۷، فہرست برود کلان ج ۲ ص ۳۳۷-۳۳۸، ایضاً ضمیمہ ج ۲ ص ۳۷۲-۳۷۳، طبع ۱۹۲۹، مجمع المطبوعا العربیة زیر سیرکیس ۱۵۸۸۱-۱۸۵۹ وغیرہ۔

ادبی و ثقافتی تاریخ کے اہم ابواب یقیناً ہماری نظروں سے اوجھل رہتے۔ ملوک بنی احرار کی تاریخ میں ابن الخطیب سے زیادہ موثق اور کون ہو سکتا ہے جو خود وزارت عظمیٰ کے منصب پر سرفراز رہ چکا ہے۔ آٹھویں صدی کے اندلسی علماء اور ادباء، شعراء اور ابواب دول کے حالات اور ان کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کی صحیح تصویر ابن الخطیب ہی کے آثار قلم میں مل سکتی ہے۔

ابن الخطیب آٹھویں صدی کے مصنفین کی صف میں نہایت ممتاز و بلند پایہ مصنف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی جملہ تصانیف جن کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے ان میں سے ایک تہائی کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ تصنیف و تالیف سے اتنا شغف تھا کہ زندگی کے سب سے زیادہ پر آشوب دور میں بھی جب کہ مخالفوں کی ریشہ دوانیوں سے بسیط ارض اس کے لیے تنگ ہو رہی تھی، اس کا ایشہب قلم برابر مصروف خرام رہا چنانچہ المباحر الطیبیة فی المفاخر الحطیبیة، خلع النرسین اور اعلام الاملا ماسی دور کے نقوش ہیں ایک اور تصنیف جو غناطہ سے منتقل ہونے کے بعد ترتیب پائی الکتیبة الکامنتہ کے نام سے موسوم ہے۔ ذیل میں اسی کتاب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے آٹھویں صدی کے اندلسی شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ عربی ادبیات کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت قیمتی سرمایہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایک مخصوص عہد کے اندلسی شعراء کا تعارف ابن الخطیب جیسے حلیل القدر ادیب و شاعر کی زبان قلم سے حاصل ہوتا ہے۔ جو ان سے ذاتی طور پر واقف اور ان کے فضل و کماں کا شاہد عینی ہے الاحاطة، نغم الطیب اور بعض دوسری تصانیف کے ذریعہ اس عہد کے شعراء کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن الکتیبة کو شعراء کا مخصوص تذکرہ ہونے کے لحاظ سے مستقل اہمیت حاصل ہے۔

الکتیبة کا پیش نظر نسخہ پہلے کلکتہ کے مشہور مفتی اور مدرسہ عالیہ کے حلیل القدر مدرس مولانا سید محمد عمیم الاحسان مجددوی کی ملکیت تھا اب یہ ادبی سرمایہ ان کے ایک تلمیذ رشید مولانا ابو محفوظ اکرم معصومی کی ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ ایک نسخہ پیرس کے کتب خانہ (Bilalnia Treque national)

میں تخت رقم (۵۷۹۲) محفوظ ہے۔ پیرس کا مخطوطہ بخط نسخ مغربی ایک سو پندرہ اوراق کے ایک مجموعہ میں (ورق ۱۵ اب۔ ورق ۱۱۵) سترھویں یا اٹھارویں صدی مسیحی کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کے ایک اور نسخے کا ذکر ڈاکٹر ای۔ ڈی روس، مکتبہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی سالانہ رپورٹ بابت ۵-۱۹۰۶ م سوسائٹی کی خرید کردہ عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست میں کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اب تک یہ نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔

پیش نظر نسخہ ایک سو اسی اوراق میں (ورق اب۔ ورق ۱۱۹) ختم ہوتا ہے۔ ہر صفحہ میں اٹھارہ سطریں ہیں۔ تاریخ کتابت اور کاتب کا نام موجود نہیں۔ لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ یہ تقریباً ڈیڑھ دو سو برس پیشتر کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا خط جو بہر معنی مغربی مراکشی ہے۔ جو بلاد مشرق میں رواج پذیر نہ ہونے کی وجہ سے مشرقی علماء کے لیے غیر مانوس و مشکل رہا ہے۔ چنانچہ شیخ ابرہیم بن احمد الباعونی کو بھی اس خط کی صعوبت کی شکایت تھی۔ بلکہ وہ تو خود ابن الخطیب کے خط کو مشکل کہتے تھے۔ حالانکہ یہ قول علامہ مقرئ ابن الخطیب کا خط اہل مغرب کی نظر میں محمود و قابل تائیس ہے۔ اس مخطوطہ کے ہر صفحہ کی ابتدا و صلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ و صحبہ وسلم بالاسلام ہوتی ہے اور اس سے ہمیں کاتب کے متعلق صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پختہ شمس کا ندھبی آدمی ہوگا۔ کتاب کے جملہ عنوانات سرخ روشنائی سے مرقوم ہیں۔ ہر صفحہ اول کی ابتدا میں مندرجہ ذیل عبارت بھی احمر ہے :-

• قال الشيخ الفقيه الماجد ابو عبد الله محمد بن الخطيب السلماني رحمه الله  
قال في روضي عنه

فقہ کا لفظ جس شہور معنی میں متداول ہے وہ اہل مشرق کی اصطلاح ہے۔ اندلس و بلاد مغرب میں پھیل کر یہ لفظ کچھ اور ہی معنی میں مستعمل ہوا۔ وہاں علماء فقہ کے لیے یہ مخصوص نہیں رہا۔ بلکہ امرار، وزراء اور ائمہ خود لغت کے لیے بھی اس کے استعمال کا رواج ہوا۔ چنانچہ علامہ مقرئ کا بیان ہے :-

• وسمه الفقيه عند هم جلیلة حتى ان المسلمين كانوا يسمون الاميراء<sup>لعظم</sup>

منہم الذی یریدون تنویہہ یالفقیہ ... وقد یتولون للکاتب والنحوی  
واللغوی فقیہ لانہا عندہم اسر فم السمات

(نفع الطیب ج ۱ ص ۱۰۳)

اب ہم قارئین کے سامنے الکتبہ کی ابتدائی سطریں پیش کرتے ہیں:

الحمد لله الذی جعل الادب فی جمیع ما للفنون من الاسواق، فاکتہ شہیة  
الاذواق، تھدی فی الاطباق، مکلة بالاجباق، ورمجاناً عطر الانتشاق، فی اوقات  
الکمال واکرم باولئک العشاق، وجعل بینہ نسباً ثابت الاستحقات و بین النفوس الرقاق الخ  
مقدمہ میں ابن الخطیب اندلس سے بلاد مغرب کی طرف آخری روانگی کا تذکرہ اپنے مخصوص  
طرز نگارش میں کرتا ہوا مغربی احباب کے لیے اس کتاب کی تالیف کا ارادہ ظاہر کرتا ہے کہ غناط  
کے بے خان و مان رئیس الوزراء کے پاس بجز علمی و ادبی سرمایہ کے اور کیا باقی رہ گیا تھا جو اہل  
مغرب کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا جاتا مصنف کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

فجعلت الهدیة من جنس ما تشوق الیہ النفوس الغنیة، وتبحر فی اسواقہ الہم  
السنیة من وضع یستظرون، واختراع الیہ یستشرون، واثریل علی طول المتوسلی و  
طریقة المتعرف المسترسل، یظہر منہ مصروف عنایتہ، وشرح کنایتہ، و بیان رعایتہ  
ومرعی رعایتہ، وتبین ما وراء عیفتہ من عنوانہ، و یخبر فذلک عن تفصیل دیوانہ،  
وینوب مکتوبہ عن لسانہ، فیما ینتحل من احسانہ، فجمعت فی ہذا الكتاب جملة وافرة  
وکتیبة ظافرة ممن لقیناہ ببلدنا الذی طوینا جدید العصر فی ظلہ، وطاردت  
قنائص الآمال فی حرمہ وحلہ، ما بین من تلقینا افادته، واکرمنا وفادته الخ  
چند سطروں کے بعد ذیل کی عبارت ملتی ہے۔

والمقصود انما هو الماع بتعریف، وجلب ادب ظریف، بل التماس العام  
ممن یقف علیہ وتشریف، وان ینظر النقص بعین کمالہ ویعذر المهدی فی  
تقصیرہ واسمہالہ، فالله لا یكلف العبد فوق احتیالہ، سمیت ہذا المجموع  
بالکتیبة الکامنة فین لقیناہ بالاندلس من شعراء المائة الثامنة،

يستدل به من مباشرة على نبل من كنا معاشره، ولقفت من يد ارسه على فضل من  
كنا رسده، وان كان جالب مثل هذا الى البلاد المشرقية اعز الله اهلها  
وامن حزنها وسهلها جالب تعباً الى غدیر، وحبابة الى كاس مد ير فالعدا  
الى الوسع مصروف ولا تجوديد الا بما تجرد مثل مصروف الخ

ابن الخطيب کے قلم سے شعراء و ادبا کے تذکرہ میں دو کتابیں التاج المحلی اور الاکلیل الزہرا  
پہلے ہی نکل چکی تھیں۔ الکتیبہ میں بعض تراجم ان دونوں کتابوں سے منقول ہیں۔ التاج المحلی کا ذکر  
مقدمہ میں ان الفاظ میں آتا ہے:-

وقد كنت جمعت في الزمان المنصرم قبل ان يرسل الله على شباننا سبيل  
العزم وقبل ان يعناض الشيب بحال الهرم، وخلف البهرم مائة شاعر و  
عشرة، وسميته بالتاج المحلی في مساجلة القدر المعلى۔  
شعراء الکتیبہ کے حسب ذیل تین طبقے ہیں:-

۱۔ طبقہ الخطباء النصحاء والصفوة الصالحاء (ورق ۳ ب ورق ۳ ب)۔  
اس طبقہ کے شعراء کی تعداد اکتیس (۳۱) ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق ابن الخطیب  
کی رائے مندرجہ ذیل ہے:-

قلت وهذه الطبقة اهلها اعلام سراوة ومجادة، وليسوا بحجة في  
اجادة، الا من جرى منهم مجرى افادة في وجادة، ومظنة الاجادة في  
هذا الكتاب هم طبقة الشعراء والكتاب؛

۲۔ طبقہ القضاة (ورق ۳ ب۔ ورق ۴ ب)۔ اس طبقہ میں کل چوبیس  
شاعر مذکور ہیں ان میں سے قاضی ابو جعفر احمد بن عتیق شاطبی کا ترجمہ "الاکلیل" سے اور  
قاضی ابو جعفر احمد بن محمد المعافری، قاضی ابو الحسن احمد بن یحییٰ التیمی، قاضی احمد  
بن محمد الشاشی اقبسی کے تراجم "التاج المحلی" سے منقول ہیں۔ اس طبقہ کے متعلق

۱۔ ابو الحسن بن سعید کی تصنیف کا نام، یہ کتاب الامامة والنفع الہیب کے اہم مصادر میں سے ہے۔

مصنف کا تبصرہ یہ ہے :-

” و هذه الطبقة منحطة في البيان، لاقتصار مدالكها على عموم الاديان، وما

يصدر عنها على جهة الافتنان“

۳۔ طبقة الكتاب والشعراء (ورقة ۵۲۔ ورقہ ۱۱۹) اس میں شعرا کی تعداد انچاس ہے۔

ان میں سے ابوالقاسم محمد بن محمد، ابواسحق ابراہیم بن یحییٰ، ابوعلی حسین بن عبدالحکیم، ابو عمر یحییٰ بن ابراہیم کے تراجم ”الاکلیل“ سے اور ابواسحق ابراہیم بن محمد القیس، ابوبکر محمد بن احمد الجذائی، ابوالقاسم انخضر بن احمد، علی بن اجمیاب، ابوبکر بن ابی عبداللہ زدی الوزارین، ابو عبداللہ محمد بن ابی القاسم الکلبی کے تراجم ”التاج المحلی“ سے منقول ہیں۔ شاعری میں اسی طبقہ کو تقدم حاصل ہے۔ ابن الخطیب کے الفاظ یہ ہیں :-

” و ربما كانت هذه الطبقة متميزة بالاستحسان، تميز البركة بمطر النيسان و

مظنة لدرر بحار اللسان الممنون بها على عالم الانسان“

یہ مخطوطہ احمد بن سلیمان بن احمد بن فرکون کے مندرجہ ذیل ابیات پر یکایک ختم ہو جاتا ہے۔

امولای عذرا عن مغیبی فلم اکن لا غفل عن طرس لدیك اجیدة

یراعی فی الکراس طوراً رکوعه و طورا بحراب الدواة سجودہ

ولکن طرفی ... .. لحظة یفارقنی طوع اشتیاقی هجودہ

وها .. .. غرس العماک التي غیوث الهدایا کل یوم تجودہ

.. .. فیہ شفاء ورحمة و بحر یها ما یعز و جودہ

فما ذاعیسی انھیہ من شکر منعم یولف بین انضب والنون جودہ

ان ابیات پر مجموعہ کا ختم ہو جانا بظاہر اس کے نقص پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن حاشیہ

پر کاتب کے الفاظ یہ ہیں :-

الحمد لله، وجدت بالاصل هنا ما نصه الى هنا توجد هذه الكتيبة

ولعل مولفها اختارته المنية قبل تمامها، والله اعلم۔

اس امر کا قطعی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی دوسرا مخطوطہ دستیاب نہ ہو جائے۔ اگرچہ ظن غالب یہی ہے کہ اس کی تکمیل سے پیشتر ہی ابن خطیب دشمنوں کی سفاکی کا شکار ہوا۔ انوس ہے کہ پیرس کی فہرست بھی اس مسئلہ پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔

اس مختصر تعارف کے بعد ہم قارئین کرام کو ابن الخطیب کی نکبت وادبار کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کے دوزبردست دشمنوں کے نام لیں گے۔ جن کو ابن الخطیب نے اپنے عہد وزارت میں ناصب عالیہ پر سرفراز کیا تھا۔ لیکن وقت و نجات کی نامساعدت کے ساتھ ہی دونوں بنی خطیب کی جان کے دشمن ہو گئے اور اس کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا اس کی پیروی میں دونوں پیش پیش رہے۔ ان میں سے ایک ابو عبد اللہ بن زمرک ابن الخطیب کے مخصوص تلامذہ میں تھا اور دوسرا شخص وافی ابو الحسن بن الحسن النباہی بڑی حد تک ابن الخطیب ہی کا نمک پروردہ تھا۔ کتاب الاحاطہ کی تعریف کے دوران میں ابن الخطیب کے تعلقات ان دونوں سے نہایت شگفتہ و خوشگوار تھے۔ لہذا الاحاطہ میں ان کے تراجم تابندہ و پائندہ الفاظ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن الکتیبة کی تالیف کا زمانہ ابن الخطیب کی کتاب زندگی کا سب سے زیادہ تیرہ و تارہ یک باب تھا، جبکہ اکثر احباب و مخلصین اس سے منہ موڑ چکے تھے اور اس سے کھلی عداوت کا اظہار اپنے قول و فعل سے کر رہے تھے۔ نیز فساد اعتقاد، اتحاد و زندگہ اور جملہ سادی و متالِب کو اس کی ذات سے منسوب کر رہے تھے۔ لہذا اس تالیف کے صفحات میں ابن الخطیب کی زبان قلم ان احسان فراموشوں کی مثال نگاری میں طرازی بھرنے لگتی ہے۔ اب ابو الحسن النباہی و ابن زمرک کی تصویر الکتیبة میں کتاب الاحاطہ کے برعکس نہایت مکروہ و مسخ شدہ نظر آتی ہے۔ ہم ابن زمرک اور ابو الحسن النباہی کے متعلق الکتیبة کی بعض عباد میں جن کی طرف المقری نے نفع الطیب میں اشارہ کیا ہے ذیل میں نقل کریں گے۔ ان اقتباسات سے پہلے مقری کی چند سطروں کا پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

واعلم ان لسان الدين لما كانت الايام له مسالمة لم يقدر احد ان يواجهه

لنفع الطيب ج ۳ ص ۶۲ (بجذت زواہ)



باید نس معالیہ ... فلما قلبت الايام له ظهر مجنبا ... اکثر اعداؤه في شأنه  
الكلام ونسبوه الى الزندقة ... والظن ان مقامه ... من بسها برى ... وكان  
الذى تولى كبر محنته وقتله تلميذاه ابو عبد الله بن زهرک ... ومن اعدائه  
الذين باينوه ... القاضى ابو الحسن النباهى اه

وشم القاضى ابن الحسن عن ساعد اذا ابته والتسجيل عليه بما يوجب الزندقه  
كما سبق جميعه مفصلاً محسنين اطلق لسان الدين عنان قلبه في سب المذكور  
وثلبه واورد في كتابه الكتيبة الكامنة في انباء المائة الثامنة من مثالبه ما  
انسى ما سطره صاحب القلائد في ابن باجة المعروف بابن الصائغ اه  
الكتيبة میں قاضی ابوالحسن کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے :- اطروفة الزمن  
التي تجعل غرائبها الثمن، وقرود شارف من قرود اليمن، ذنباً واحداً، وفروة  
واشداً، واشارة واصطلاحاً، وخبثاً وسلاحاً، لا يفرق بينهما في الشكل، وقرب  
العائظ من الأكل، تشغل به الصبيان اذا بكت، وتسلم بذكره الزهاد بعد ما  
نسكت وعن كل شئ امسكت الخ  
قاضی کے متعلق جو عجیب و غریب واقعات اس کتاب میں درج ہیں ان میں سے  
ایک ہمارے قارئین بھی سنیں -

حدث من يوثق به من العدول قال: جرى بين يد يه الحديث الشهير  
الجاري بمجالس القضاة: البيعان بالخيار ما لم يتفرقا، فقال لى: سبحان الله يا فقيه  
كانوا في القديم مثلنا في البادية يتبايعون بالخيار والفواكه كما نتبايع بالحبوب من

له نفع: ۳/ ۷۴

۷ رسالہ النباہی الی ابن الخطیب، نغم الطیب ج ۳ ص ۶۵ - ۷۰، ایضاً ص ۹۸، ۹۹

۸۷ الکتیبة کا نام نغم الطیب ج ۳ ص ۶۵ اور ص ۲۲۲ میں بھی آیا ہے نیز ابن الخطیب کی تصنیف کے بیان میں (ج ۲)

۸۸ کلہ قلائد العقیان: ص ۳۲۶ - ۳۵۳، طبعہ سلیمان الحارثی ۱۲۷۷ھ

الفجر والشعير، (ورق ۵)

اسی کتاب میں ابن الخطیب، قاضی نبیہی کو "جسوس" کا لقب دیتا ہے اور اس پر مزید ذیل کا  
 "الموطع" ہے:-

وقال بعض فضلاءهم: سمعته يقول: تنكرون علي ما يكثرتوردة في كلامي من  
 لفظ جسوس، كانه ليس من كلام العرب ولا من الفاظ القرآن فقلنا له: اما في كلام العرب  
 فربما، واما في القرآن فلا نعرفه فضحك وقال سبحان الله! اعد النظر، فقلنا: والله  
 ما نعرفه: فقال: الم يقل الله في القرآن: ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا،  
 فقلنا: والله ما قال الله ذلك قط وانما قال تجسسوا قال: فاسترجع وقال: يا فتية!  
 حفظ الصغر؛ (ورق ۵ ب)

یہ تو الکتبہ کی باتیں ہیں معلوم نہیں کتاب خلع الرمن فی التعریف<sup>۱</sup> باحوال ابن الحسن میں  
 کیا کیا فضائح و مثالب بیان کیے ہوں گے! ابن الخطیب کے غیظ و غضب کا دوسرا نشانہ ابن زمرک<sup>۲</sup>  
 ہے۔ اس کے ترجمہ کی چند سطریں پیش کی جاتی ہیں:

هذا الرجل والنصغیر علی اصله، وان لم یعیب السهم منغر  
 فصله مخلوق من مکیدة وحذر، مفطور اللسان عن هذیان  
 وهذر، کثیر الا لتفات والاخر اس خبیث ان شکر، خدع ومکر،  
 ودس فی الصفوا العکر، وان رمی واقصد، فالله اعلم بما قصد  
 الا انه فی البخت بخت نصر عند من اعتبرو وتبصر، بینما هو  
 فی المطبخ یغسل البرم، ولعیش الضرم اذا به یفتش السندس  
 ویفتم سیفه القدس الخ (ورق ۱۰۸ ب)

۱۔ نفع الطیب ۶۵/۳

۲۔ نفع الطیب ۶۵/۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹

۳۔ ابن زمرک کا ترجمہ، نفع الطیب ۶۴/۲، الدرر الكامنة ج ۲ ص ۱۲-۱۳

ہم لسان الدین بن الخطیب جیسے گرفتار مصائب و محن کو اس ہجو نگاری میں معذور سمجھتے ہیں اور ابن الخطیب کے مشہور و معروف اختصاصی علامہ مقری کے ان الفاظ پر سلسلہ کلام کو ختم کرتے ہیں:

واعلم ان لسان الدین بن الخطیب الغایۃ فی المدح والمقدح  
فتارة على طريق الترسيل وطوراً على غيرها، وقد اذع وبالنعم  
رحمه الله تعالى في هجوا عدته بما لا تحتمله الجبال وهو أشد من  
وقع النبال - (ع ۳ ص ۷۴)

# مالک ابن نویرہ کا واقعہ

اور

## حضرت خالد بن ولید

حضرت ابو بکر صدیق نے مرتد اور باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے جو گیارہ لشکر مختلف اطراف میں روانہ کیے تھے ان میں ایک لشکر حضرت خالد بن الولید کے ماتحت تھا۔ حضرت خالد پہلے بڑھ گئے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے مقام بطلح کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے دیکھا کہ مطلع صاف ہے تو آپ نے مختلف سمتوں میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے دستے (سرباٹ) اس غرض سے روانہ کیے کہ قبیلوں میں جو سرکش اور باغی ہوں ان کی سرکوبی کریں۔ قبیلہ بنو تمیم کی شاخ بنو یروع کا سردار مالک بن نویرہ ایک شخص تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل مسلمان ہو گیا تھا۔ اور آپ کی طرف سے چند اور عمال صدقات کے ساتھ یہ بھی بنو تمیم کے صدقات وصول کرنے پر متعین تھا۔ لیکن جب اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع ملی تو وہ مرتد ہو گیا اور جو زکوٰۃ و صدقات اس نے جمع کیے تھے ان کو دینے بھیجنے کے بجائے قبائل میں تقسیم کر دیا۔

حضرت خالد کا ایک دستہ واپس آیا تو مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھ چند اور لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ حضرت خالد کے سامنے یہ لوگ پیش ہوئے تو ان کا دستہ میں سے حضرت ابو قتادہ انصاری اور چند لوگوں نے شہادت دی کہ مالک بن نویرہ ارتداد سے تائب اور مسلمان ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت خالد نے اس کی پروا نہیں کی اور مالک بن نویرہ کو مع اس کے ساتھیوں کے قتل کر دیا۔ اور پھر اسی دن

مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم سے جو بڑی خوبصورت تھی نکاح کر لیا۔ ابوقتادہ انصاری اس پر سخت برہم ہوئے اور حضرت خالد سے بڑی سخت کلامی کی۔ انھوں نے اس پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ مدینہ پہنچ کر خلیفہ رسول سے حضرت خالد کی شکایت کی اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ خلیفہ رسول نے جب اس پر کوئی توجہ نہیں کی تو ابوقتادہ فاروق اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمر کو یہ پوری داستان سن کر بے حد غصہ آیا۔ صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہو کر مطالبہ کیا کہ حضرت خالد کو فوراً معزول کیا جائے اور چونکہ ایک مسلمان کو عداوت کیلئے کیا ہے اور اس کی بیوی سے عداوت گزرنے سے پہلے ہی نکاح بھی کر لیا ہے جو باطل ہے اس لیے ان کو قتل یا رجم کیا جائے۔ حضرت ابو بکر فرماتے رہے کہ خالد سے سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے اس لیے ان کو معذور سمجھنا چاہیے۔ اور وہ معزول کرنا تو آپ نے فرمایا۔ جس تلوار کو انشہ نے اپنے دشمنوں پر بے نیام کر دیا ہے (اشارہ حضرت خالد کے لقب سیف انشہ کی طرف) میں اس کو نیام میں واپس نہیں کروں گا۔ حضرت عمر نے ایک نہ سنی وہ اپنی بات پر برابر اصرار کرتے ہی رہے۔ آخر حضرت ابو بکر نے حضرت خالد کو مدینہ بلایا، ان سے گفتگو کی جس میں حضرت خالد نے عذر خواہی کی۔ صدیق اکبر نے ان کا عذر قبول کیا اور پھر اسی عہدہ پر محاذ جنگ پر بھیج دیا۔ اور ساتھ ہی مالک بن نویرہ کا خون بہا اس کے بھائی مسم بن نویرہ کو بیت المال سے ادا کیا۔

یہ واقعہ کا اصل متن ہے جس پر واقدی، حافظ ابن حجر، طبری، ابن اثیر، یعقوبی، ابن خلکان اور ابن شاکر ان سب کا اتفاق ہے۔ کتاب الاغانی، طبقات الشعراء اور خزائن الادب وغیرہ ادبی کتابوں میں واقعہ پر جو افسانہ کارنگ چڑھایا گیا ہے اور یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ حضرت خالد ام تمیم سے دیرینہ محبت رکھتے تھے (یہواہانی الجاہلیۃ) وہ اس پر مستزاد ہے کہ ہم اس افسانوی حصہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک واقعہ کے اصل متن کا تعلق ہے اور جس پر محدثین سے مورخین تک سب کا اتفاق ہے اس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اب سوالات ذیل پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) اگر مالک بن نویرہ مسلمان تھا جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے تو حضرت خالد اس کو قتل عداوت کیا یا خطا۔

(۲) اگر عہد کیا تو ان سے قصاص لینا چاہیے تھا۔ پھر دیت دینے کا کیا موقع تھا اور وہ بھی بیت المال سے۔

(۳) اور اگر وہ قتل خطا تھا تو اول تو یہ احتمال اس لیے بعید ہے کہ حضرت خالد سے اسی طرح کا ایک واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بنو جذیمہ کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ جس کا طلال حضور کو اس درجہ ہوا تھا کہ آپ نے اس واقعہ کی خبر ملتے ہی بارگاہ ایزدی میں دو مرتبہ فرمایا اللھم انی ابرء الیک ما صنم خالد اے خدا جو کچھ خالد نے کیا ہے میں اس سے برتر ہوں حضرت خالد ایسے صحابی سے بہت مستبعد ہے کہ دو تین سال کے اندر ہی اندر دو مرتبہ ایک ہی قسم کی غلطی کا اور وہ بھی اتنی شدید ارتکاب کریں اور اچھا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مالک بن نویرہ کا قتل غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا تو پھر آخر اس کی کیا تاویل ہوگی کہ حضرت خالد نے ام تمیم سے اس کی عدت گزرنے سے پہلے ہی نکاح کر لیا۔ اور جب ان کو غلطی معلوم ہو گئی تو اس وقت بھی طلاق نہیں دی۔ اور نہ اس کو الگ کیا۔

(۴) حضرت ابو بکر جو بشریت اور اقامت حدود کے معاملہ میں بہت سخت تھے اس واقعہ میں انہوں نے کیوں حضرت خالد کے ساتھ چشم پوشی کی اور اغماض کا برتاؤ درست رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ عام روایت کے مطابق اس درجہ سنگین اور پیچیدہ ہے کہ مورخین اس میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور مذکورہ بالا سوالات کا جواب نہیں دے سکے ہیں۔ مصر کے مورخین حال شیخ محمد خضریٰ بکٹ، محمد حسین ہیکل، رفیق بک العظیم ان سب نے حضرت خالد کی طرف سے عذر خواہی کی ہے۔ لیکن اس طرح کہ تاریخ کے ایک طالب علم کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن اس واقعہ کا نہایت سرسری طور پر ذکر کر کے اسی طرح آگے بڑھ گئے ہیں کہ گویا اس

۱۔ تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۱ ص ۱۷۷

۲۔ الصدوق ابو بکر ص ۱۵۷، ۱۵۸

۳۔ اشہر مشاہیر الاسلام ج ۱ ص ۱۵۳، ۱۵۴

۴۔ تاریخ الاسلامی سیاسی ج ۱ ص ۱۹۰

میں کوئی عجوبہ بات ہی نہیں ہے۔ اردو زبان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے خلفائے راشدین، تاریخ اسلام حصہ اول اور سیر الصحابہ تین ایسی کتابیں شائع کی ہیں جن میں اس واقعہ پر بحث ہوئی چاہیے تھی لیکن ان کو اس کے ذکر تک کی جرأت نہیں ہو سکی۔ اور وہ اسے صاف اڑا گئے۔ البتہ مکتبہ برہان دہلی کی طرف سے مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جو کتاب اشاعت اسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے اس میں تین چار جگہوں پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم نہایت ذکی و ذہین اور بڑے فاضل بزرگ تھے۔ چنانچہ اس کتاب کو انہوں نے صرف واقعات کی کھتونی نہیں بنایا۔ بلکہ اہم واقعات کے اسباب و علل اور ان کے باہمی ربط پر فاضلانہ گفتگو بھی کی ہے اور طریق استدلال بڑی حد تک منطقیانہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ واقعہ زیر بحث پر گفتگو کرتے وقت مولانا مرحوم نے بھی عام روایت کی پیروی کی ہے اور پھر اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکے ہیں۔

چنانچہ مالک ابن نویرہ کی ارتداد پر پشیمانی اور ندامت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں "مالک ابن نویرہ بے شبہ مسلمان ہو چکے تھے" اب اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ خالد قتل مسلم مرتکب ہوئے تو مولانا جواب دیتے ہیں "مگر غلط فہمی سے مقتول ہوئے" لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں اس کو محض غلط فہمی کہہ دینے سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس سے ایک طرف تو حضرت خالد کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی اور دوسری جانب ام تمیم کے ساتھ حضرت خالد کے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہوتا "چنانچہ جہاں تک امراہل کا تعلق ہے مولانا مرحوم کو حضرت خالد کی نسبت یہ الفاظ لکھنے پڑے ہیں۔

"تاہم ان سے (حضرت خالد سے) بعض ایسے امور بھی صادر ہوئے جو خود جناب سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا مبارک کے خلاف اور مصلحت اسلام کے منافی تھے" یہ واقعہ بھی نہیں امور میں داخل ہو سکتا ہے جو حضرت خالد بمقتضائے مصلحت وقت بلا اجازت و استفسار اپنی رائے سے کر بیٹھے تھے۔ غور کرو حضرت خالد جس مرتبہ و عظمت کے صحابی ہیں اس کے پیش نظر مذکورہ بالا

اقتباسات کے کیا معنی ہیں۔ رہا امر ثانی یعنی ام تمیم سے نکاح تو مولانا اس کا جواب دیتے ہیں کہ قتل ہونے کے بعد ہر مسلمان کو جائز تھا کہ مقتول کی زوجہ سے عقد نکاح کرنے لے لیکن مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ کیا مقتول کی زوجہ سے قبل انقضائے عدت بھی نکاح جائز ہے؟ واقعہ زیر بحث میں حضرت عمر کو جو شدید غصہ تھا اور جس کی وجہ سے انھوں نے حضرت ابو بکر سے خالد بن الولید کو رجم کرنے کا مطالبہ کیا تھا کیا اس کی بنیاد بھی جائز نکاح تھا؟ علاوہ بریں اس واقعہ کا یہ ایک پہلو نہایت اہم اور لائق توجہ ہے کہ اگر مالک بن نویرہ کو مسلمان مان لیا جائے تو حضرت عمر کا غصہ ہونا، حضرت خالد کو برا بھلا کہنا یہ سب درست اور بجا قرار پاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خلیفہ رسول حضرت ابو بکر کی معاملات شریعت میں غیر جانب داری مجرد ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے عام مورخین کی نظر سے واقعہ کا یہ پہلو اوجھل ہو گیا ہے اور وہ اس پر سے اس طرح گزر گئے ہیں کہ گویا کوئی انہونی بات ہوئی ہی نہیں ہے۔

اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اس واقعہ پر تحقیق و تنقید کے اصولوں کی روشنی میں مفصل کلام کر کے اس کی اصل حقیقت معلوم کی جائے۔ اس سلسلہ میں ہم کو امور ذیل پر غور کرنا ہوگا۔

- (۱) مالک بن نویرہ کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ!
- (۲) مالک بن نویرہ کے واقعہ قتل کی اصل صورت۔
- (۳) حضرت ابو بکر کی طرف سے حضرت خالد کے اختیارات اور ان کو ضروری ہدایات
- (۴) مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت اور اس کی حقیقت
- (۵) ام تمیم کے ساتھ حضرت خالد کے نکاح کی اصل حقیقت
- (۶) حضرت ابو بکر کا عمل اور اس کے وجہ
- (۷) حضرت عمر فاروق کا غصہ اور اس کے وجہ

اب ہم تنقیحات بالا میں سے ہر ایک پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

مالک بن نویرہ کے حالات | مالک بن نویرہ بنو تمیم کی شاخ بنویرہ بوع کا سردار تھا شہسوار  
نیاضی اور بہادری میں بڑا نامور تھا عربی زبان میں ماہر کا



کصد اچ اور مرعی ولا کالسعدان کی طرح جو فتی ولا کمالک بہ طور ضرب المثل بولا جاتا ہے تو اس میں مالک سے مراد یہی مالک بن نویرہ ہے۔ اس کی کنیت ابو خنظلہ تھی اور اپنے بھائی متمم کی طرح خود بھی شاعر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل مسلمان ہوا تھا اور آپ نے اس کو اپنی طرف سے خود اس کے قبیلہ کے لوگوں سے صدقات کے وصول کرنے پر عامل مقرر فرمایا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر بنو تمیم میں پہنچی تو جو لوگ عمال صدقات تھے ان میں بعض تو بدستور اسلام پر قائم رہے اور انہوں نے جو صدقات جمع کر رکھے تھے وہ مدینے بھیج دیے بعض عامل متردد تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مالک بن نویرہ کھلم کھلا مخالف اور مرتد ہو گیا اور اس نے جمع کردہ صدقات مدینہ بھیجنے کے بجائے خود قوم میں تقسیم کر دیے اور یہ شعر پڑھے۔

فقلت خذوا أموالکم غیر خائف ولا ناظر فیما یحیی من العند

فان قام بالدين المنخوف قائم اطعنا وقلنا الدين دين محمد

ترجمہ: میں نے کہا کہ بغیر خوف کے اپنے اپنے مال لے لو اور یہ مت دکھو کہ کل کیا ہوگا پھر اگر خوفناک دین (اسلام) کو کوئی قائم کرے تو ہم اس کی اطاعت کر لیں گے۔ اور کہہ دیں گے کہ دین تو محمد کا دین ہی ہے۔

یہ مالک بن نویرہ کے ارتداد کا پہلا قدم ہے۔ اب اس کے بعد سے لے کر قتل ہونے تک

اس کے حالات کیا رہے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مالک بن نویرہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ زکوٰۃ روک لی بلکہ جب سجاح بنت الحارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سن کر ایک لشکر کثیر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے جزیرہ (عراق) سے روانہ ہو کر بنو تمیم میں پہنچی تو مالک بن نویرہ نے

۱۔ کامل مبرد جلد ۱ ص ۶

۲۔ الاصابۃ ج ۳ ص ۳۳۶ ذکر مالک بن نویرہ تیسرے مصرعہ میں اصل کتاب میں "المخوف" چھپا ہوا ہے

لیکن یہ غلط ہے صحیح "المخوف" ہے۔

اس کے ساتھ ساز باز کر لی۔ اور اس جھوٹی مدعیہ نبوت کا دست راست ہو گیا۔

فلما انتھت الی الحزن راسلت  
مالک بن نویرہ ودعتہ الی الموادعہ  
فاجابھا  
دی۔ مالک نے اس دعوت پر لبیک کہا

(۲) سجاح مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن مالک بن نویرہ نے کہا کہ بنو تمیم میں جو لوگ مسلمان ہیں پہلے ان کی سرکوبی کرنی چاہیے۔ چنانچہ سجاح نے یہی کیا اور مالک بن نویرہ نے اس کی ہر طرح مدد کی۔ سجاح کے ہاتھوں ان قبائل پر جو تباہی اور بربادی آئی چونکہ خود اس میں مالک بن نویرہ کا بھی دخل تھا اس بنا پر خود اس کے قبیلہ بنو یویع کے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ ابن اثیر کا بیان ہے:

وکرھوا ما صنع مالک بن نویرہ  
اور مالک بن نویرہ نے جو کچھ کیا تھا یہ لوگ اُسے

نا پسند کرتے تھے۔

جن لوگوں نے مدینہ سے اپنا رشتہ مالک بن نویرہ جیسے آدمیوں کے بھڑکانے سے منقطع کر لیا تھا اب ان کی بھی آنکھ کھلی اور وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوئے یہ

(۳) سجاح کے عراق لوٹ جانے کے بعد زبیرقان، وکیع بن مالک اور سماعہ جو مالک بن نویرہ کے ساتھ اسلام سے باغی اور مرتد ہو گئے تھے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ حضرت خالد بطاح پہنچے تو ان لوگوں نے آپ کا استقبال کیا اور اپنے جمع کیے ہوئے صدقات آپ کے حوالے کر دیے۔ لیکن مالک بن نویرہ کو اب بھی ہوش نہیں آیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنے قبیلہ میں گھس گیا یہ

۱۔ ابن جریر طبری ۲۵ ص ۲۹۶ مطبوعہ الاستقامتہ قاہرہ ۱۹۳۹ء

۲۔ طبری ۲۵ ص ۲۹۶

۳۔ تاریخ الکامل ج ۲ ص ۲۰۰ مطبوعہ لیڈن

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

ایک مخالطہ | اس موقع پر مورخین عام طور پر کہتے ہیں کہ مالک بن نویرہ اپنے کیے پر نادم ہو گیا تھا اور مسترد تھا۔ لیکن یہاں ان کو مخالطہ ہو گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مالک نادم اور متحیر و مسترد ضرور تھا۔ لیکن کس بات پر؟ اپنے امداد اور حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ رسول سے بغاوت پر یا سجاح کے ساتھ مل کر بنو تمیم کو پامال کرنے پر۔ اگر پہلی صورت تھی تو اس کے لیے مانع کون سی چیز تھی؟ جب وکیع بن مالک، سماعہ اور امرائے بنو تمیم جن کی نسبت حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:

فاستقبلہ امراء بنی تمیم بالسمع والطاعة  
بنو تمیم کے امرانے حضرت خالد کا بطراح میں  
خیر مقدم کیا اور ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا۔

ان سب نے حضرت خالد کے سامنے اپنے اسلام کی تجدید کر لی تھی تو مالک بن نویرہ بھی یہ کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور قبیلہ میں جا بیٹھا۔ اصل یہ ہے کہ سجاح کی اعانت و امداد اور اس کے ذریعہ سے بنو تمیم پر جو سخت بربادی آئی تھی اس کی وجہ سے خود مالک کے قبیلہ کے لوگ اس کو برا سمجھنے لگے تھے۔ ایک طرف خود اس قبیلہ میں اس کی بدنامی اور رسوائی کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ خالد بن الولید کی فوج برق و باران کی طرح عداوت و مخالفت کے مراکز کو پامال کرتی چلی آ رہی ہے اور سجاح اپنی فوج کے ساتھ جزیرہ واپس جا ہی چکی ہے۔ ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ تھا کہ وہ نادم اور پشیمان تھا اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اسی طرح مالک بن نویرہ نے سجاح کو مدینہ پر حملہ نہ کرنے کا جو مشورہ دیا ہے اس سے بھی مورخین کو مخالطہ ہوا ہے۔ اس کا یہ مشورہ مدینہ یا اسلام کی خیر خواہی پر ہرگز مبنی نہیں تھا بلکہ صرف اس لیے تھا کہ اس کی قوم اس سے اور سجاح سے دونوں سے سخت ناراض تھی اور

۱۰ البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲ د کمال ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۰

۱۱ البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲

۱۲ مالک بن نویرہ نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے اسلامی فوج کی فتوحات کا جو ذکر کیا ہے مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کو دوسرے لوگوں کی طرف اس سے بھی مخالطہ ہو گیا ہے (اشاعت اسلام ص ۶۷)

ہرگز سبوح کو اپنی آزادی اور خود مختاری کے سلب ہو جانے کے ڈر سے مدینہ جانے کے لیے راستہ  
 لینے پر رضامند نہیں تھی بلکہ

لیکن جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔ اگرچہ اس وقت مالک بن نویرہ پر زمین اپنی وسعتوں کے باوجود  
 سنگ ہو رہی تھی اور وہ تنہائی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن جہاں تک تجدید اسلام اور توبہ عن الارتداد  
 کا تعلق ہے وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم تھا۔ چنانچہ وہ گرفتار کر کے لایا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد  
 اس کا واقعہ قتل کس طرح پیش آیا؟ اور اس کی اصل صورت کیا تھی؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔  
 واقعہ قتل کیوں کر پیش آیا اس سلسلہ میں متعدد روایات ہیں جو ترتیب وار حسب  
 ذیل ہیں:

(۱) طبری، ابن اثیر، حافظ ابن حجر اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے جو عام روایت نقل کی ہے  
 وہ یہ ہے کہ حضرت خالد کا سر یہ جب مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے  
 لایا اور حضرت خالد کے سامنے پیش کیا تو خود ارکان سر یہ میں اختلاف ہو گیا۔ ایک گروہ تو  
 اس کا قائل تھا کہ یہ قیدی مرتد ہیں لیکن چند دوسرے لوگوں نے جن میں ابو قتادہ انصاری  
 بھی تھے یہ شہادت دی کہ یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے ہمارے ساتھ نماز  
 پڑھی ہے۔ حضرت خالد نے اختلاف کی یہ صورت دیکھ کر قیدیوں کو ایک جگہ بند  
 کر کے رکھنے کا حکم دیا کہ دوسرے دن فیصلہ کریں گے۔ اتفاق سے اس شب میں سردی  
 غیر معمولی تھی اس لیے آپ نے قیدیوں کے پہرہ داروں کو حکم دیا کہ "ادفوا اسراکم" اس  
 فقرہ سے آپ کی مراد یہ تھی کہ سردی سے حفاظت کی غرض سے قیدیوں کو کچھ اڑھا دو لیکن  
 چونکہ بنو کنانہ کی بول چال میں "ادفاء" قتل سے کنایہ ہوتا ہے اس لیے پہرہ داروں  
 نے قیدیوں کا کام تمام کر دیا۔ اب شور و غل کی آواز بلند ہوئی تو حضرت خالد نے خیمہ  
 سے باہر نکل کر پوچھا "کیا بات ہے" اور جب آپ کو معلوم ہوا کہ ایک غلط فہمی کی بنا  
 پر قیدی قتل کر دیے گئے تو آپ نے فرمایا "جو اللہ کا حکم ہوتا ہے وہ بہر حال ہو کر رہتا ہے۔"

۱۔ طبری جلد ۲ ص ۲۹۸

۲۔ طبری جلد ۲ ص ۵۰۲

( ۲ ) طبری کی ہی ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت خالد نے یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ مالک بن نویرہ نے ارتداد سے توبہ کی ہے یا نہیں اور اس کی نسبت کون سی شہادت لائق اعتبار ہے خود مالک بن نویرہ کو بلایا اور گفتگو کی اثنائے گفتگو میں مالک نے ایک مرتبہ کہا "میرا خیال تو یہی ہے کہ تمہارے صاحب (آقا۔ دوست۔ ساتھی) چینیوں و چٹاں کہتے تھے " تمہارے صاحب (صاحبکم) کے لفظ سے مالک بن نویرہ کی مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ حضرت خالد نے لپٹ کر کہا "کیوں! کیا وہ تیرے صاحب نہیں تھے؟" یہ کہا اور تلوار سے گریہ اٹادی۔

( ۳ ) تیسری روایت یعقوبی کی ہے اور وہ یہ کہ ابو بکر صدیق نے حضرت خالد کو حکم دیا کہ بطاح میں مالک بن نویرہ ہے اس کا رخ کریں۔ خالد جب یہاں پہنچے تو مالک بن نویرہ کو طلب کیا یہ آیا تو اس کی بیوی ہمراہ تھی۔ خالد بولے:

واللہ لانت ما فی مثابتک حتیٰ  
بجدا جو کچھ تیرا ٹھکانا ہے تو اس کو اس وقت تک  
افتلاک نہ  
نہیں پائے جب تک میں تجھ کو قتل نہیں کر دوں گا۔

اس کے بعد دونوں میں مناظرہ ہوا اور آخر حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کی گردن اڑادی۔

( ۴ ) چوتھی روایت جو ابن جہلکان نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ مالک بن نویرہ نے اپنی قوم سے زکوٰۃ وصول کر کے اس میں تصرف کر لیا تھا۔ حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کو بلا کر اس سے باز پرس کی تو اس نے کہا کہ میں نماز پڑھتا ہوں لیکن زکوٰۃ کا قائل نہیں ہوں " حضرت خالد نے فرمایا "کیا تو نہیں جانتا کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں ہی ایک ساتھ اللہ کا فرض ہیں۔ ایک کا اعتبار بغیر دوسرے کے نہیں ہے " اس کے جواب میں مالک

۱۔ طبری ج ۲ ص ۵۰۳

۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۸

۳۔ اصل کتاب میں فقط چھپا ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ طباعت کی غلطی ہے اصل مناظرہ جو اس کی تائید طبری وغیرہ کی دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے۔

بولا لیکن تمہارے صاحب تو چنیں و چناں کہا کرتے تھے۔ حضرت خالد نے پٹ کر کہا  
 ”کیا تو ان کو (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اپنا صاحب نہیں سمجھتا۔ اس پر دونوں  
 میں تیز کلامی ہوئی۔ مالک بار بار وہی ایک بات کہے جاتا تھا اور حضرت خالد بھی  
 اس کے جواب میں وہی ایک فقرہ دہرائے جاتے تھے۔ آخر حضرت خالد نے اس  
 کی گردن اڑادی لیے۔

**تنقید روایات** | مذکورہ بالا روایات میں سب سے زیادہ اور مشہور روایت پہلی ہے۔  
 چنانچہ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نے بھی اسی کو اختیار کیا اور  
 اسی کو مدار بحث بنایا ہے اور غالباً اس روایت کی طرف عام رجحان کا سبب یہ ہے کہ اس  
 روایت کے مطابق مالک بن نویرہ کے قتل کی ذمہ داری زیادہ قیدیوں کے نگراؤں کے سر پر جاتی ہے اور  
 خالد کی طرف سے عذر خواہی کرنے کا ایک وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ روایت  
 حسب ذیل وجوہ کی بنا پر لائق اعتبار نہیں ہے:

(الف) اگر سچ بات یہی تھی کہ حضرت خالد نے حکم کچھ اور دیا تھا اور پہرہ داروں نے اس کا  
 کچھ اور مفہوم لے کر قیدیوں کو قتل کر دیا تو سوال یہ ہے کہ یہ تو ایک بالکل کھلی اور واضح  
 بات تھی پھر اس پر اس قدر ہنگامہ کیوں ہوا اور فابوق اعظم نے حضرت خالد پر قتل کا  
 الزام کیوں لگایا۔

(ب) اگر یہ صرف غلط فہمی تھی تو پھر اس سے اہم تمیم کے ساتھ قبل اذ انقضت عدت نکاح کا  
 جواز کیوں کر ثابت ہوگا۔

(ج) ادقار عربی زبان کا مشہور لفظ ہے۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں میں گرم کرنے کے  
 معنی میں مستعمل ہوا ہے پھر پہرہ داروں کا ذہن اس طرف کیوں کر منتقل ہوا کہ اس  
 موقع پر حضرت خالد کی مراد عام۔ متداول اور مرصع معنی کے برخلاف قتل کر دینا تھا۔

۱۔ ابن خلکان ج ۵ ص ۶۶ طبع جدید مصر

۲۔ اشاعت اسلام ص ۳۲۲

کہتے ہیں کہ بنو کنانہ کی زبان میں اس لفظ کے معنی قتل کر دینا ہیں لیکن ضرار بن الازور جنہوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا ہے وہ تو بنو کنانہ میں سے نہیں بلکہ اسد میں سے تھے۔ اور چونکہ اس قبیلہ کے تعلقات بنو ہاشم کے ساتھ عزیزانہ اور قرابت دارانہ تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن اور زوجہ مطہرہ حضرت زینب بنت جحش بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں اس بنا پر بنو اسد کی زبان وہی تھی جو قریش کی تھی پھر حضرت خالد کی مراد سمجھنے میں ضرار بن الازور کو مغالطہ کیوں کر ہوا۔

(۵) اگر یہ سب کچھ حضرت خالد کی مراد اور منشا کے خلاف ہوا تھا تو ان جیسے سخت اور تشدد پسند شخص کو پہرہ داروں پر کم از کم عتاب اور غصہ کا اظہار تو کرنا چاہیے تھا۔ لیکن یہاں کوئی عتاب نہیں، کوئی ناراضگی نہیں۔ اسے صرف اللہ کا حکم کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

(۶) بنو جذیمہ کے واقعہ میں حضرت خالد سے ایک غلط فہمی کا صدور ہو ہی چکا تھا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملال ہوا تھا تو حضرت خالد ایسے جلیل القدر صحابی کی شان کے خلاف یہ بات ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان سے پھر اسی نوع کی غلطی کا صدور ہو۔ ظاہر ہے ان وجوہ بالا کی بنا پر ارفار والی روایت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس کو قبول کیا جائے اور اس پر بحث و گفتگو کی بنیاد رکھی جائے۔ اب رہی باقی تین روایتیں ان کو کیجانی طور پر سامنے رکھ کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا

کہ اصل روایت وہی ہے جو ابن خلکان نے نقل کی ہے۔ باقی دونوں روایتوں میں اسی ایک روایت کے ٹکڑے لے لیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ روایت اس لیے بھی اہم ہے کہ ابن خلکان نے اس کو تیسری بن الوشاء سے نقل کیا ہے یہ تیسری صدی کے جلیل القدر مورخ ہیں اور ان کی کتاب اگرچہ ناپید ہے مگر یہ کس پایہ کی کتاب تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں کثرت سے اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ انہیں اقتباسات کو یکجا مرتب کر کے ایک جرم فاضل نے کتاب الردہ لوثیمہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ ابن شاکر اس کتاب کی نسبت کہتے

کتاب جمید بشتل علی فوائد کثیرۃ<sup>۱</sup> بہت عمدہ کتاب ہے جو فوائد کثیرہ پر مشتمل ہے۔  
اس روایت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ مالک بن نویرہ اگرچہ نماز کا قائل  
تھا لیکن وہ منکر زکوٰۃ تھا اور حضرت خالد کی بار بار تہنیتیہ کے باوجود اس نے زکوٰۃ کی فرضیت کا  
کا اقرار نہیں کیا اور یہ معلوم ہی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق کا اولاد اور تمام صحابہ کا ثانیاً مانعین  
زکوٰۃ کے بارے میں کیا فیصلہ تھا؟ اس سلسلہ میں خاص حضرت خالد کے لیے حضرت ابو بکر کے احکام  
و ہدایات کیا تھے؟ اب انھیں بھی معلوم کر لینا چاہیے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ حضرت خالد  
مالک کو قتل کر کے احکام خلافت کی خلاف ورزی کی یا ٹھیک ان کے مطابق عمل کیا۔

خلیفہ رسول نے حضرت خالد کو صاف اور صریح لفظوں میں یہ حکم دیا تھا  
**احکام و ہدایات** کہ "جب تم کسی جگہ پر پڑاؤ ڈالو تو وہاں اذان دو اور اقامت کہو۔ اگر  
اس کے جواب میں وہاں کے لوگ بھی اذان دیں اور نماز قائم کریں تو تم ان سے اپنے ہاتھ روک  
لو لیکن اس کے بعد تم ان سے پوچھو کہ تم لوگ زکوٰۃ بھی ادا کرو گے یا نہیں؟ اگر وہ ہاں کریں تو تم  
اس کو قبول کر لو اور ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔ لیکن اگر وہ اداے زکوٰۃ سے انکاری ہوں تو پھر ان  
پر دھاوا بول دو اور مزید کوئی بات نہ کرو۔"

حضرت خالد نے مقام بزاخہ میں بعض باغی اور مرتد لوگوں کو نہایت سخت سزا میں دی  
تھیں۔ یہاں تک کہ بعض مسلمانوں کو ناگوار ہی ہوئی اور حضرت خالد نے جو کچھ کیا تھا خود اس کی  
اطلاع بارگاہ خلافت میں کی اس کے جواب میں خلیفہ رسول نے جو کچھ لکھا اس سے اندازہ ہوگا  
کہ حضرت خالد کے حدود و اختیارات کس قدر وسیع تھے۔ صدیق اکبر لکھتے ہیں:

جد فی امر اللہ ولا تین ولا تظن  
باعد قتل المسلمین الا قتلته و نکلت به  
غیرۃ و من اجبت ممن حاد اللہ او فاضلہ  
اشترکے کاموں میں پوری کوشش کرو اور سستی  
نہ دکھاؤ۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہے ان میں  
کوئی شخص اگر تمہارے ہاتھ لگ جائے تو تم اس کو

۱۔ فتاویٰ الوفیات ج ۲ ص ۶۲۵۔ تذکرہ ابو زبیر و شیمہ

۲۔ طبری جلد ۲ ص ۵۰۲



مَنْ تَرَىٰ اِنْ فِي ذَاكَ صِلٰحًا فَاَقْتُلْهُ  
 قتل کر دو اور دوسرے لوگوں کے لیے اس کو عبرت بناؤ  
 ان کے علاوہ جن لوگوں نے اللہ سے مخالفت اور بغاوت  
 کی ہے ان میں سے اگر کسی کے قتل کرنے کو تم مناسب  
 اور مفید سمجھو اس کو بھی قتل کر دو۔

اب غور کرو مالک بن نویرہ مرتد ہونے کے بعد سے برابر اپنی اسلام دشمن سرگرمیوں میں مصروف  
 رہا۔ سجاج سے ساز باز کر کے بنو تمیم میں جو مسلمان تھے ان کو قتل کرایا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام  
 باندی بنوایا۔ پھر حضرت خالد بطاح پہنچے تو دکیع - سماعہ - قیس بن عاصم اور دوسرے امرائے بنو تمیم  
 کی طرح مالک نے حضرت خالد کا خیر مقدم نہیں کیا۔ اس کے بعد جب پکڑا ہوا آیا تو حضرت خالد کی  
 بار بار تنبیہ کے باوجود اس نے زکوٰۃ ادا کرنے کی ہامی نہیں بھری اور گفتگو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کو برابر "صاحبکم" کہتا رہا۔ اور حضرت خالد کے یاد دلانے پر بھی اس کا اقرار نہیں کیا کہ حضور خود اس  
 کے بھی صاحب ہیں۔ یہ سب کچھ ذہن میں رکھنے کے بعد یہ بھی دیکھو کہ حضرت خالد کے لیے بارگاہ  
 خلافت کی طرف سے احکام و ہدایات کیا تھے؟ ان حالات میں حضرت خالد نے مالک بن نویرہ  
 کو قتل کیا تو کیا بیجا کیا؟ یہ ایک مسلمان کا قتل تھا یا ایک انتہا درجہ سرکش۔ باغی اور فتنہ انگیز مرتد کا۔  
 حضرت خالد کا یہ فعل حضرت ابوبکر کے منشا اور مقصد کے خلاف تھا یا عین اس کے مطابق؟ ایک  
 روایت میں تو یہ یہاں تک ہے کہ

وَعَزِمَ عَلَيْهِ لِيَقْتُلَنَّ مَا لَكَ اِنَّ اخذَهُ  
 حضرت ابوبکر نے حضرت خالد سے قسم لی کہ اگر مالک

ان کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ اس کا کام تمام کر دیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مالک بن نویرہ کے قتل کی نوعیت بالکل صاف اور  
 واضح ہو جاتی ہے اب ہم کو اس شہادت کا بھی جائزہ لینا چاہیے جو مالک بن نویرہ کے اسلام سے متعلق ہے۔

۱۰ طبری ج ۲ ص ۲۹۱

۱۱ خزائن الادب ج ۱ ص ۲۴۳ خاص حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ابو یاسین احمد بن ابی ہاشم  
 الہیثمی نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ شیخ عبدالقادر بن عمر البغدادی نے اس رسالہ کے اقتباسات نقل کیے ہیں یہ فقرہ ہی اقتباس میں ہے۔

مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت | یہ عجیب بات ہے کہ جو گروہ مالک بن نویرہ کو  
اگر قتار کر کے لایا تھا اس میں اگرچہ کافی لوگ ہونگے

لیکن مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت صرف دو شخصوں سے مزوی ہے ایک متمم بن نویرہ اور دوسرے  
ابوقتادہ انصاری۔ اول الذکر مالک بن نویرہ کے بھائی ہیں اور بھائی بھی کیسے؟ ان کے جو اشعار مالک  
کی مدح میں ادب کی کتابوں میں مذکور ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ متمم کو اپنے بھائی کے ساتھ  
کس درجہ عقیدت و ارادت اور محبت تھی۔ اب رہے ابوقتادہ انصاری تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ  
جلیل القدر صحابی ہیں لیکن اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل دو باتیں قابل غور ہیں:

(۱) ایک یہ کہ حضرت ابوقتادہ نے جو شہادت دی ہے اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک  
بن نویرہ نے اذان دی اور نماز پڑھی۔ لیکن ادائے زکوٰۃ کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ مالک  
بن نویرہ سے جو جنگ تھی وہ اسی بنا پر تھی محض اقامتِ اذان و صلوة کی شہادت سے اس کا  
اسلام اور توبہ عن الارتداد کیوں کر ثابت ہو سکتے ہیں؟

(۲) حضرت خالد بن اخیلہ سے جب بعزم بطاح روانہ ہونے لگے تھے تو انصاری نے اسی وقت  
اعتراض کیا تھا اور انھوں نے حضرت خالد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا بعد میں جب ان کو اپنی غلطی  
کا احساس ہوا تو وہ کسی منزل دور جا کر حضرت خالد سے ملے۔ پس جب انصاری کے تعلقات  
حضرت خالد کے ساتھ پہلے ہی سے خوشگوار نہیں تھے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات میں  
حضرت خالد کے خلاف ایک انصاری کا بیان قانون شہادت کی رو سے کیا وزن رکھ سکتا ہے  
یہی وجہ ہے کہ جب ابوقتادہ انصاری نے مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر سے خالد بن الولید کی  
شکایت کی اور پورا واقعہ بیان کیا تو حضرت ابوبکر نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی بلکہ  
بعض روایتوں میں تو یہ بھی ہے کہ آپ ابوقتادہ پر خفا ہوئے۔

بہر حال واقعات کی ترتیب اور مالک کے اسلام سے متعلق شہادت کی یہ خامی اور تشنگی

۱۔ دیکھو البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۲۲، والاصابہ ج ۳ ص ۲۳۷

۲۔ تاریخ کامل ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۲

ان سب کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ اگر مالک درحقیقت مسلمان ہو بھی گیا تھا تو اب یہ معاملہ اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ وہاں بے شبہ اس کو اجر ملے گا۔ لیکن جہاں تک دلائل اور شواہد کا تعلق ہے حضرت خالد اس کے قتل کرنے میں حق بجانب تھے اور ان پر قتل مسلم عمداً یا خطاً کا کوئی الزام ہرگز عائد نہیں ہوتا۔

**ام تمیم کے ساتھ نکاح اور اس کی حقیقت** | اب ہم کو واقعہ کے دوسرے اہم جز یعنی ام تمیم کے ساتھ نکاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ واقعہ

زیر بحث میں مالک بن نویرہ کے ساتھ اور بھی اس کے ساتھی ماسے گئے تھے اور سب کا معاملہ ایک ہی تھا لیکن اس کے باوجود حضرت خالد کے خلاف جو شورش بپا ہوئی اس کی بنیاد مالک بن نویرہ کا ہی قتل تھا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مالک بن نویرہ کا بھائی متمم بن نویرہ اپنے زمانہ کا نامور شاعر تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے مرثیوں کو اس سوز و درد کے ساتھ لکھے کہ انھوں نے آگ لگا دی۔ بچہ بچہ کی زبان پر پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ خود حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اگر شعر کہہ سکتا تو متمم کی طرح میں بھی اپنے زید کا مرثیہ کہتا۔ حضرت عائشہ نے اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابی بکر کو یاد کر کے جو شعر پڑھے ہیں اور جو صحیح بخاری میں مذکور ہیں وہ بھی وہی ہیں جو متمم نے مالک کے مرثیہ میں کہے تھے۔ لیکن متمم کی شاعری اور مرثیہ گوئی سے بھی بڑھ کر بڑی وجہ حضرت خالد کا ام تمیم سے جس کے حسن و جمال پر سب کا اتفاق ہے عقد نکاح کر لینا ہے۔

جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شعر کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ان کی ذمہ داری حضرت خالد پر کیوں کر عائد ہو سکتی ہے؟ خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

رہی دوسری وجہ تو یہ غلط ہے کہ حضرت خالد نے مالک جس دن قتل ہوا ہے اسی روز نکاح کیا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ مالک مرتد قتل ہوا تھا اس لیے اس کی بیوی کو حضرت خالد نے پہلے باندی بنایا پھر اس کو خریدا اور اس کے بعد آزاد کر کے اس سے نکاح کیا۔ چنانچہ ابن شاکر محمد بن عمر الواقدی اور ابو زید دشیمہ بن الوشاء کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

قبیل اند اشتر اھا من الفی و کہتے ہیں کہ خالد نے ام تمیم کو مال غنیمت میں سے

تزوج بها وقيل انها اعتدت بثلاث  
حيض ثم خطبها الى نفسه فاجابته

خریدا تھا اور پھر ان کے ساتھ نکاح کر لیا تھا بعض لوگ  
یہی کہتے ہیں کہ ام تمیم نے عدت پوری کی تھی۔ اس کے  
بعد خالد نے ان کو پیغام نکاح دیا تو انھوں نے قبول کر لیا۔

اسی سے ملتی طبری میں بھی ایک روایت ہے جس سے قتل مالک کے بعد فوراً نکاح کرنے  
کی تردید ہوتی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وتزوج خالد ام تمیم ابنة  
المنهال وترکھا ینقضی طهرها  
اور خالد نے ام تمیم سے شادی کی اور اس کو اس  
کے طہر کے پورا ہونے تک کے لیے چھوڑ دیا۔

ان روایات کے پیش نظر ہمارا قیاس یہ ہے کہ صورت یہ پیش آئی ہوگی کہ پہلے حضرت خالد  
ام تمیم کو باندی کی حیثیت سے اپنے تصرف میں لائے ہوں گے اور بعد میں جب اس نے اسلام  
قبول کیا ہوگا تو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا ہوگا۔ اڑانے والوں نے جب مالک بن نویرہ کے  
اسلام کا چرچا کیا تو چونکہ اب اس کی بیوہ باندی بن نہیں سکتی تھی اس بنا پر اس کے ساتھ حضرت  
خالد کی تسری کو انھوں نے "تزوج" سے تعبیر کر دیا۔ حالانکہ یہی ابوقتادہ انصاری ہیں جو اس  
خبر کے سب سے بڑے ذمہ دار ماوی ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی موجودگی میں  
نکاح ہوا تھا تو انھوں نے صاف اس سے انکار کیا۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) اگر درحقیقت واقعہ کی صورت یہی ہے تو حضرت خالد نے بغیر اذن خلیفہ کے، سبایا  
(گرفتار شدگان جنگ) میں کیونکر تصرف کیا۔ انھیں اس کا حق کہاں تھا؟

(۲) حضرت عمر فاروق نے حضرت ابو بکر سے یہ مطالبہ کیوں کیا کہ وہ خالد کو رجم کریں۔ پہلے  
سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت خالد نے درپردہ حضرت  
ابو بکر سے اس کی اجازت لے رکھی ہو۔ یا ممکن ہے کہ انھوں نے بمنظوری خلافت ایسا  
کیا ہو اور جنگ کے موقع پر بسا اوقات ایسا ہوتا ہی ہے۔

۱۰۲۸، ۱۰۲۵ ص ۲۶

۱۰۲۸ ص ۵۰۲

۱۰۲۸ ص ۲۶

علاوہ بریں ہم ذیل میں ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے اس قسم کے معاملات میں بیک وقت حضرت خالد اور حضرت عمر فاروق دونوں کے نقطہ نظر اور عمل و کردار کا فرق ظاہر ہوگا اور اس سے دونوں سوالات کا جواب مل جائے گا۔

خلافت فاروقی کے زمانہ میں حضرت خالد نے بنو مسد کی طرف ایک سر یہ روانہ کیا جو ضرار ابن الازور کی ماتحتی میں تھا۔ اس سر یہ نے ایک عورت گرفتار کی۔ ضرار نے ارکان سر یہ سے درخواست کی کہ وہ عورت ان کو دے دیں۔ ان لوگوں نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور ضرار اس عورت کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ لیکن چونکہ ضرار نے یہ حرکت بغیر حضرت عمر کی اجازت کے کی تھی اس لیے ان کو بعد میں ندامت ہوئی اور انھوں نے حضرت خالد سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا ”نہیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے“ لیکن ضرار نے اصرار کیا کہ اس بارہ میں حضرت عمر فاروق کو لکھ کر باقاعدہ اجازت حاصل کر لیں۔ اب حضرت خالد نے اس اصرار کے مطابق عمل کیا تو حضرت فاروق کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے حکم بھیجا کہ ضرار کو رجم کر دیا جائے اتفاق یہ ہوا کہ حکم فاروقی پہنچنے سے پہلے ہی ضرار کا انتقال ہو گیا۔ جب حضرت خالد کو یہ حکم ملا تو بولے ”ماکان اللہ لیخزی ضراراً“ اللہ نہیں چاہتا تھا کہ ضرار رسوا ہوں۔

پس جس طرح اس روایت کے مطابق حضرت خالد نے مسلمانوں کی اجازت سے ضرار کے فعل کو جائز قرار دیا اسی طرح وہ اپنے معاملہ میں بھی ام تمیم میں تصرف کو جائز سمجھتے تھے لیکن جس طرح حضرت عمر فاروق بغیر اذن خلیفہ کے ضرار کے فعل کو حرام اور اس بنا پر اس کو سختی رجم سمجھتے تھے اسی طرح ام تمیم کے معاملہ میں بھی وہ حضرت خالد کے عمل کو حرام امان کو سختی رجم قرار دیتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے ام تمیم کے معاملہ میں تو حضرت ابو بکر خلیفہ تھے اس بنا پر اگر وہ خالد کے تصرف کو جائز قرار دیں تو پھر حضرت عمر کا مطالبہ رجم خالد قطعاً بے بنیاد ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کے مطالبہ کو رد کر دیا۔

جہاں تک مالک بن نویرہ کے نفس واقعہ اور حضرت  
**حضرت ابو بکر کا دیت ادا کرنا** | خالد کے ام تمیم کے ساتھ نکاح کا تعلق ہے مسئلہ

بالکل صاف اور واضح ہو جاتا ہے البتہ ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مالک بن نویرہ کے قتل کرنے میں حضرت خالد بن ولید نے شرکت کی اور اسی بنا پر حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کے شدید اصرار کے باوجود حضرت خالد کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی تو پھر آخر صدیق اکبر نے متمم بن نویرہ کو خوں بہا کیوں ادا کیا؟

جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت ابو بکر کی رائے میں حضرت خالد نے نہ کسی ناجائز فعل کا ارتکاب کیا تھا اور نہ انھوں نے اپنی حد سے آگے قدم رکھا تھا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابو بکر کو اس واقعہ کا طال اس لیے ضرور تھا کہ اگر حضرت خالد مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بجائے مدینہ بھیج دیتے تو جس طرح جنگ بذاخذہ کے قیدی قرۃ بن عبیدہ اور عیینہ بن حصن الفزازی وغیرہا مدینہ آکر مسلمان اور اپنے ارتداد سے تائب ہو گئے تھے اسی طرح اغلب کیا یقین تھا کہ مالک اور اس کے ساتھی بھی مسلمانوں کی طاقت و قوت اور عفو و حلم صدیقی کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے، ایک طرف حضرت ابو بکر صدیق کا یہ ذاتی احساس و تاثر تھا اور دوسری جانب متمم بن نویرہ جو مسلمان تھا اس کی دلجوئی بھی ضروری تھی۔ اس بنا پر حضرت ابو بکر نے بطور تالیف و قلب نہ بطور سزا خوں بہا ادا کیا اور یہی وجہ ہے کہ خوں بہا خالد بن الولید سے نہیں دلوایا بلکہ آپ نے خود بیت المال سے ادا کیا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ فعل صرف حکومت کی سیاسی مصلحت بینی کا نتیجہ تھا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ صدیق اکبر جن کی فطرت اور طبیعت ہی اتباع و پیروی اسوہ نبوی بن گئی تھی انھوں نے اس موقع پر وہی کیا جو اسی نوع کے ایک موقع پر اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے یعنی بنو جذیمہ کے چند افراد کے قتل پر جب خالد کے خلاف احتجاج ہوا تو آپ نے ذاتی طال و حزن کے باوجود ایک طرف تو یہ کیا کہ حضرت خالد کو ان کے منصب سے الگ نہیں کیا اور دوسری جانب حضرت علی کی معرفت بنو جذیمہ کو نصف خوں بہا ادا کیا۔ لیکن یہ خوں بہا صرف درنائے مقتولین کی دلجوئی اور ان کی تسلی و تسخنی کی خاطر تھا۔ چنانچہ حضرت تالاسناذ مولانا محمد نور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

مولانا محمد نور شاہ کشمیری (م ۱۹۳۷ء) مجموعی حیثیت سے آیت من آیات اللہ (بقیہ صفحہ ۹۸ پر)

وهذا عندی محمول علیٰ نحو  
مصالحۃ فافهم وان لم یطال بوجہ بشی  
لکنہ لم یرض ان یهدرد مہم

اور یہ خوں بہا ادا کرنا میری رائے میں ایک  
طرح کی مصالحت پر مبنی تھا کیونکہ بنو جذیمہ نے  
اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا مطالبہ  
نہیں کیا تھا لیکن بایں ہمہ آپ نے پسند نہیں کیا  
کہ مقتولین کا خون رائگاں جائے۔

اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے اور  
**حضرت ابو بکر و عمر کا اختلاف** وہ یہ کہ آخر حضرت ابو بکر و عمر میں اس معاملہ میں  
اس قدر شدید اختلاف کیوں ہوا؟ تو ایک وہ شخص جس نے عہد نبوت اور اس کے بعد عہد  
خلافت صدیقی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ دونوں بزرگوں کا یہ کوئی پہلا اختلاف نہیں تھا  
صلح حدیبیہ، غزوہ بدر، غزوہ احد اور پھر عین وفات نبوی کے وقت، اس کے بعد  
جیش اسامہ کی روانگی اور مانعین زکوٰۃ سے قتال کے مواقع پر بھی اسی نوع کے اختلافات  
ہو چکے ہیں۔ لیکن اختلافات کا نتیجہ کیا ہوا؟ حضرت عمر فاروق نے اپنی رائے سے شروع  
کیا اور صدیق اکبر کی اصابت رائے، حسن تدبیر اور سنجیدگی فکر کی داد دی۔ چنانچہ معاملہ  
زیبخت میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بعد میں اسی واقعہ کے سلسلے میں حضرت عمر نے اعتراض  
کیا کہ:

رحم اللہ ابابکر ہو کان اعلم  
منی بالرجال  
انشد ابو بکر پر رحم کرے۔ وہ میری بہ نسبت  
زیادہ مردم شناس تھے۔  
حضرت عمر کے عہد خلافت میں متمم بن نویرہ نے پھر حضرت خالد سے قصاص کا

(بقیہ ماضیہ صفحہ ۹) اور غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے صف اول کے علما میں سے تھے۔ ان کی  
حیات اور علمی کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ میری نگرانی میں قادی محمد رضوان اللہ نے لکھا ہے اور جس  
پر انھیں اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔

مطالبہ کیا تو آپ نے اس کو رد کر دیا اور فرمایا :

لا اسرہ شیئاً صنعہ ابو بکرؓ  
ابو بکر جو کچھ کر چکے ہیں میں اس کو رد نہیں کرتا

اصل یہ ہے کہ حضرت عمر کے مزاج میں اول تو یوں ہی تشدد پسندی بہت زیادہ تھی اور پھر اس وقت تک ان پر خائفانہ و حکومت کی براہ راست ذمہ داری کا بارگراں نہیں پڑا تھا۔ اس لیے حضرت ابو بکر صدیق کی نظر دقیقہ رس حکومت و سیاست کے جن باریک نکات پر رہتی تھی حضرت عمر سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب خود حضرت عمر اس بوجھ کے مستعمل ہوئے تو حضرت ابو بکر کی پیش گوئی کے مطابق جو آپ نے وفات کے وقت حضرت عمر کے لیے اپنی نیابت و قائم مقامی کی سفارش و نامزدگی کرتے ہوئے کی تھی۔ خلیفہ دوم میں بھی وہی اعتدال مزاج اور سنجیدگی طبع پیدا ہو گئی جو اس منصب عظیم کے لیے ضروری تھی۔

اب غور کرو مالک بن نویرہ کی اصل حقیقت کیا تھی؟ اور ہمارے مورخین کی بے توجہی کے باعث کیا سے کیا بنی رہی۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا





## صحیح نامہ

صحیح	غلط	سطر	صفحہ
الصائبین	الصائبین	۵	۱
فلن	قلن	۱۵	۲
صابون سے کون	صابون کون	۱	۳
توراہ میں اخوخ	توراہ اخوخ	۱۶	۱
کو	اس کو	۱۴	۱
میں	ہیں	۱	۲
اندازہ ہوتا ہے	اندازہ ہے	۸	۳
بھی	ہی	۱۶	۱
اور	وہ	۱۸	۲
x	کہا	۱۶	۱
زندیق	زندیق	۱۸	۲
مٹا ح	مٹا ل	۹	۱
پہنچنا	پہنچا	۷	۱
نفی	نفی	۳	۲
انتقم	انتقم	۳	۲
فطر	قطر	۲۰	۲
خنیفت	خنیفت	۱۳	۲
عیائیت	عیائیت	۱	۲

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۷	۵	کردے	کردیے
۳۹	۳	برات	برارت
۴۲	۷	اھتدوا	اھتدوا
۴۲	۲۲	التبیہ	التبیہ
۴۵	۱۸	الوزراء	الوزراء
۴۷	۱۲	لکنہ	لکنہ
۴۸	۲	جدیدیہ	جدیدیہ
۴۸	۱۴	جدیدیہ	جدیدیہ
۵۱	۱۲	کتبا	کتب



سلسلہ منشورات دینیات فقہیہ ۲

# چار علمی مقالات

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

صدر شعبہ مستی دینیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

۱۹۶۶